1544

سیلابِ تبسم

یعنی

ہندوستان کے مشہور مزاح نگار

شوکت۔ تھانوی

کے مزاحیہ مضامین کا تیسرا قابل قدر مجموعہ جسمیں کا ہر مضمون مصنف کے
تازہ افکار طبع کا نتیجہ ہے مزاح لطیف اور ظرافت سنجیدہ کا اعلیٰ معیار کیا ہونا چاہئے
اس کا جواب اس مجموعہ کا ہر مضمون ہے ظرافت نگاری اور سوقیانہ انداز تحریر کا امتیاز
ان مزاحیہ مضامین کو دیکھکر ہو سکتا ہے جنمیں باوجود مزاح اور ظرافت کے کسی جگہ بھی ابتذال
یا سوقیانہ انداز کی مثال نہ ملیگی اس مجموعہ کا ہر مضمون بجائے خود مصنف کا شاہکار ہے
اور ہر مضمون کا ہر جملہ ظرافت سنجیدہ کا معراج ہے۔

جسے حسب ایماء مصنف ممدوح

منیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ

نے شائع کیا

مطبوعہ اشاعت العلوم پریس فرنگی محل لکھنؤ

بار اول ۲۰۰۰ جلد

فہرست مضامین

نمبر سلسلہ	مضمون	صفحہ	نمبر سلسلہ	مضمون	صفحہ
۱	ٹائیٹل	۱	۱۳	بوا جعفری خانم	۱۱۹
۲	فہرست مضامین	۲	۱۴	پکچر پیلس	۱۳۳
۳	مقدمہ	۳	۱۵	برقعہ	۱۴۱
۴	من آنم کہ من دانم	۱۳	۱۶	جی ہاں پٹے ہیں	۱۵۳
۵	تعزیت	۱۷	۱۷	علاج بالغذا	۱۶۰
۶	چالیسواں	۳۱	۱۸	پان	۱۷۱
۷	ہم زلف	۴۵	۱۹	عشق کی گولیاں	۱۸۱
۸	آرام کرسی	۵۳	۲۰	بہن ہمسائی	۲۰۹
۹	گھاگرا پار	۵۹	۲۱	بسم اللہ اللہ اکبر	۲۲۱
۱۰	بیوی کا پروپیگنڈا	۸۱	۲۲	سگریٹ	۲۳۶
۱۱	تار کا منی آرڈر	۹۳	۲۲	قطع کلام	۲۴۷
۱۲	امرود کا چور	۱۰۹	۲۴	شامت	۲۵۹

مقدمہ

(از مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی۔ اے ایل ایل بی وکیل چیف کورٹ ہاوڑہ)

ایک وکیل کو مقدموں سے کہاں تک دلچسپی ہو سکتی ہے اسکا اندازہ شاید کوئی وکیل ہی لگا سکے پھر نئے وکیل تو یہ نہیں دیکھتے کہ مقدمہ فوجداری کا ہے یا دیوانی کا یا کسی متفرقات صیغہ کا انھیں تو مقدمہ سے مطلب! لہذا مجھے چنداں ضرورت نہیں کہ اس "مقدمہ بازی" کیلئے کوئی معقول عذر تراشوں، بلکہ شاید میرے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ اس نوعیت کے کسی "ادبی مقدمہ" کا وجود تو بڑی چیز ہے ذکر بھی اپنے رجسٹر مقدمات سے نکال کر پیش کرسکوں۔

جی ہاں، مجھے فخر ہے کہ میں حضرت شوکت تھانوی جیسے مسلمہ ادیب اور مزاحیہ نگار کی ایک بہترین کتاب پر مقدمہ لکھ رہا ہوں کسی کتاب یا تحریر کا لطف خاص طور پر جب حاصل ہو سکتا ہے جب

مصنف کے ہمعصروں کے مضامین بھی پیش نظر ہوں۔ دراصل موازنہ ہی ایک ایسی چیز ہے جسکے ذریعے سے مضامین کا اصل لطف حاصل ہوتا ہے۔

موجودہ دور کے مزاحیہ نگاروں کی اگر فہرست تیار کیجائے تو حضرت مُلّا رموزی سے لیکر ہر وہ شخص مزاحیہ نگار ثابت ہوجائے گا جسنے کوئی مزاحیہ مضمون دکھایا سنا ہو لیکن اگر واقعی دکھا جائے تو چوٹی کے مزاحیہ نگار صرف تین چار ہیں۔ آغا فرحت۔ حضرت پطرس مسٹر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی اور بعد اُسکے تو اللہ کے فضل سے سب ہیں۔ چنانچہ ہم خود بھی کہہ سکتے ہیں کہ "ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں" یعنی اگر میرا نام یا حضرت ملّا رموزی کا نام اسمیں اور جوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں خود اپنی ذات سے تنقید شروع کرتا ہوں محض اسوجہ سے کہ پستی سے بلندی کی طرف چلنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

قصہ کو مختصر تو دو لفظوں میں اسطرح کیا جا سکتا ہے کہ شوکت مجھ سے نہ صرف اچھا لکھتے ہیں بلکہ بہت اچھا لکھتے ہیں، بہت ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لوگ خیال کریں کہ میں یہ بات دل سے نہیں لکھ رہا ہوں محض اس لیے کہ شیطان نے ہر مزاحیہ نگار کے کان میں یہی پھونک دیا ہو کہ "بیٹا تجھ سے اچھا کوئی نہیں لکھ سکتا" مگر اور واقعہ یہ ہو کہ مزاحیہ نگاری میں شوکت کی میں گرد کو نہیں پہونچ سکتا۔ اگر افسانہ نویسی اور مزاحیہ نگاری میں کوئی فرق ہو اور آپ

اسکو محسوس کرنا چاہتے ہیں تو میرے افسانے اور شوکت کے مضامین دیکھئے۔ میرے مضامین مزاح کی صحیح چاشنی اور زبان کی لطافت اور شگفتگی سے خالی نظر آئیں گے۔ لے دیکر میری تمام مزاحیہ نگاری کا دارومدار محض "افسانویت" یعنی پلاٹ پر ہے۔ پلاٹ نکال لیجئے تو پھر کچھ نہیں رہ جاتا۔ لیکن شوکت بغیر پلاٹ کے ایسا مضمون لکھتے ہیں کہ میرا بہترین سے بہترین پلاٹ اسکے آگے کچھ نہیں۔ بطور نمونہ زیر نظر مجموعہ میں "بیوی کا پروپگنڈا" دیکھئے۔ ملاحظہ ہو دوست کی حماقت کہ جورو تو دوستوں کے خلاف جوتی پہ "دھار" رکھے ہوئے ہے اور شوہر صاحب ہیں کہ خواہ مخواہ کا پروپگنڈا کرتے پھر رہے ہیں۔ کس قدر واہیات آم کھلاتے ہیں (پھر شوکت ہی کا حصہ ہے) اور کس خوبصورتی سے آموں کی تعریف کرتے ہیں "دیکھو یہ آم چھوٹے ضرور ہیں اور ان کا ریشہ بھی بہت بڑا ہے لیکن عجیب پرکیف آم ہیں تم ان کی کھٹاس پر جاؤ (سبحان اللہ) اور نہ رس کی کمی پر غور کرو۔۔۔۔۔۔۔" مزاحیہ نگاری اس کو کہتے ہیں۔

دراصل مزاحیہ نگاری کا یہاں کمال نظر آتا ہے اور یہی شوکت کا اصلی رنگ ہے۔ پھر لطف یہ کہ آخری جملہ اسکا "اور لاتنے سے آم میں گٹھلی تو دیکھو، ماشاء اللہ کتنی بڑی ہے۔۔۔" بخدا میں تو

دس دفعہ ہضم لوں جب بھی یہ بات ہرگز نہیں پیدا کرسکتا جو اس جملہ میں ہے
لفظ "کوشش بھی کروں یا کرتا تو لفظ "انشاء اللہ" کا یہ استعمال ؟ بخدا
میری دانست میں شوکت اس سے بڑھکر مزاحیہ نگاری کی خود اپنے یہاں سے
بھی کوئی مثال مشکل سے پیش کرسکیں گے مضمون کی پوری کونیڈی اس
لفظ "انشاء اللہ" میں بند کردی ہے. ساتھ ہی لطف یہ ہے کہ گو ان کے مضامین کا
محض پلاٹ پر دارومدار نہیں ہوتا لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ شوکت کے یہاں
پلاٹ کی خوبی ہی نہیں ملیگی بلکہ "شامت" کو ملاحظہ فرمایئے تو اس میں ایک
معمولی سے واقعہ کے ساتھ قصہ کو کتنا عمدہ پلاٹ دیا ہے جسکی تعریف نہیں
ہوسکتی۔ "بیوی کا پروپگنڈا" بھی کسی طرح پلاٹ سے خالی نہیں۔ مضمون کے
آخری حصہ میں بہترین "ٹریجیڈی" پیش ہے۔

قصہ مختصر جہانتک میرا اور شوکت کا تقابل یا موازنہ ہوسکتا ہے میں
ایک افسانہ نویس یا ناول نویس بنکر شوکت کے پایہ کو چھونے کی کوشش
کرسکتا ہوں مگر بحیثیت مزاحیہ نگار کے شوکت کا رنگ میرے لئے قابل تقلید
ہے نہ کہ قابل تنقید۔ دراصل مزاحیہ نگاری اور چیز ہے اور افسانوں میں عشقیہ معاملات
اور شوخی و شرارت سے جان ڈالنا اور بات ہے۔ قصہ مختصر میری مزاحیہ نگاری
میں عشق و محبت کی داستان زائد ہے اور اس چیز کو دوسرے مزاحیہ نگاروں
نے بالخصوص نہیں چھوا ہے۔

اسکے بعد میں چوٹی کے ادیب کو لیتا ہوں یعنی آکا فرحت۔ لوگ
کہتے ہیں کہ اُردو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ادب کے تمام
صیغے اور تمام محکمے ان کے غلام ہیں۔ آکا فرحت کس گھر نبد ہیں مزاحیہ نگاری
افسانہ نویسی اور حد ہو گئی شاعری بھی۔ لہٰذا ان کا اور شوکت کا مقابلہ
اسطرح ہو سکتا ہے کہ شوکت ایک خاص ملک ادب کے مالک ہیں مگر آکا فرحت
کے یہاں تو وہ چنگیزی پہ عملدرآمد ہے۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ آکا فرحت کو
زبان کی بڑی بھاری جبیت ہے۔ جی میں آتا ہے پلاٹ سے مزاحیہ نگاری پیدا
کر دیتے ہیں اور جی میں آتا ہے زبان سے۔ اور جی میں آتا ہے "یونہی" آکا فرحت
کی زبانی مزاحیہ نگاری کا کمال "اصلاح سخن پر میرے خیالات" میں آتا ہے
مضامین فرحت حصۂ سوم دیکھئے۔ اور اس ادب کے شاہکار اور زبان کی
زبردستی کو دیکھئے کہ کس غضب کی مزاحیہ نگاری ہے۔ آکا فرحت کا مقابلہ
شوکت اپنے رنگ میں ضرور کرتے ہیں اور جہانتک اپنے رنگ کا یا انکا ہمیہ مضامین کے
لکھنے کا تعلق ہے شوکت بھی اُن سے کم نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آکا فرحت
یہ پڑھکر ایک پھُریری لیں اور دھر گھسیٹیں کچھ کہ میں جھوٹا ہو جاؤں۔
حضرت پطرس کو لیجئے جو کچھ بھی چند مضامین ان کے موجود ہیں
وہ مضمون نہیں بلکہ ادبی ہیرے ہیں۔ میں یہاں شوکت اور ان کے
مضامین کا موازنہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک عجیب ناقابل بیان خوبی پطرس کے

جماؤں میں ہے۔ شوکت کے یہاں اتنی ہی خوبصورت چیزیں ہیں مگر جنس اور ہے۔ دونوں کی مزاحیہ نگاری اپنے اپنے رنگ میں خوب ہے اور دونوں اپنے اپنے رنگ کے بادشاہ ہیں۔

حضرت ملا رموزی کسی زمانہ میں ملک کے واحد اور بہترین مزاحیہ نگار رہ چکے ہیں وہ اپنا نیا اور نرالا رنگ لیکر آئے۔ اور یقینًا چیز پیش کی اور جو ان کی قدر ہوئی وہ اُسکے مستحق تھے مگر ان کے یہاں کی نئی چیز پرانی ہوکر رہ گئی۔ انکی جدت قابلِ تعریف ہے مگر بار بار ایک ہی بات کا دُہرانا نکی مقبولیت کیلئے ستم ہوگیا۔ "ننھے میاں کی والدہ" ایک ایسا جملہ تھا کہ دُنیا کی جدت اور مزاحیہ نگاری اسمیں موجود تھی لیکن یہ جملہ خود حضرت ملا رموزی نے معہ مبالغہ ہر مضمون میں کوئی سو دفعہ استعمال کیا حتیٰ کہ اسکا استعمال بدمذاقی کا ثبوت ہوکر رہ گیا ہے بجائے ہنسی کے اب اس جملہ کو پڑھکر رونا آتا ہے۔ قصہ مختصر ملا رموزی کی تمام مزاحیہ نگاری کا دارومدار چند جملوں پر تھا جو بار بار دُہرائے جا چکے اور اب نہیں کچھ نہیں رہ گیا۔ پھر خیر سے ملا صاحب از خود مزاحیہ نگاری کو چھوڑ کر لیڈری کے چکر میں پڑ گئے اور اپنی قسمت انھوں نے جمیعتہ العلماء سے وابستہ کرکے کچھ اور ہی کرنا شروع کر دیا۔ یعنی فی الحال بقول مسٹر رشید احمد صدیقی ملا صاحب اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ پھر اس سلسلہ میں انھوں نے اب غصہ کا اتنا

زیادہ استعمال شروع کردیا ہے کہ کوئی شائستہ ادبی پرچہ ان کے اس
سب وشتم کا متحمل نہیں ہو سکتا جو وہ علی گڑھ کالج کے خلاف بالخصوص
اور مہذب اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت کے خلاف بالعموم اپنی قہقہہ بریت
کے رنگ میں کرجاتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ مزاحیہ نگاری اور تجارتی دونوں
مقاصد کو انھوں نے مدغم کرکے رکھدیا اور ساتھ ہی اپنے ذاتی پروپگنڈہ
اور کتابوں کی اشاعت کا بار بھی مزاحیہ نگاری کی نازک کمر پر لادیا۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ "بھینس کیچڑ میں بیٹھ گئی" اور ملا صاحب کو "لاٹھی اور بھینس" کی فکر پڑی
مزاحیہ نگاری اور مزاحیہ نگار دونوں ملا صاحب کے ہمیشہ ہمیشہ احسان گزار
اور مداح رہیں گے تو ان وجوہات کی بنا پر شاکی بھی رہیں گے! انھوں نے
مزاحیہ نگاروں کی اگر توہین کی تو مزاحیہ نگاری کی تذلیل کی۔ شوکت تھانوی کو
ملا صاحب سے کوئی مناسبت نہیں۔ ملا صاحب کے مقابلہ میں صرف یہی کہدینا کافی ہے کہ
شوکت ادیب اور مزاحیہ نگار ہیں اور ملا صاحب محض ایک "غور طلب مصلح"
نہ کہ مزاحیہ نگار۔

حضرت رشید احمد صدیقی کی اور شوکت کی مزاحیہ نگاری میں عجیب دلچسپ
مناسبت بھی ہے اور فرق بھی۔ فرق یہ کہ اگر مسٹر صدیقی بلاغت کے ساتھ
مزاحیہ نگاری کے عجیب و غریب نمونے پیش کرسکتے ہیں تو شوکت اپنی فصاحت اور
شستگی میں جواب نہیں رکھتے۔ مسٹر صدیقی کے ریمارک غضب کے ہوتے ہیں

ہجو طنز کی شاید مزاحیہ نگاری میں ان کے برابر کوئی نظیر پیش ہی نہیں کر سکتا۔ ایک جگہ جامعہ ملیہ کی "کھدر نگاری" کے بارے میں فرماتے ہیں "کچھ پتہ ہی یہاں (جامعہ ملیہ میں) نہیں چلتا کہ پروفیسر کون ہے اور چپراسی کون ہے" در اصل یہ تعریفی جملہ بھی ہے کیونکہ وہاں پروفیسران بھی اسلامی خدمت کا نمونہ دکھانے میں بعض اوقات بستر درست کر دیتے ہیں۔ مناسبت دونوں میں یہ ہے کہ دونوں حضرات کے یہاں روزمرہ کے واقعات سے لیجئے میری طرح کسی غیر معمولی واقعہ یا پلاٹ کے قطعی محتاج نہیں۔ شوکت اور صدیقی میں ہجو یا طنز کا پہلو بھی بعض جگہ یکساں ملیگا۔ مگر جیسا عرض کر چکا بلاغت گیسا تھ مزاحیہ نگاری کا کمال دکھانا اور قانون نگاری اور مزاحیہ نگاری کو ملا کر ظرافت نگاری کا کمال دکھانا خاص مسٹر صدیقی کا رنگ ہے اور یہی بات اُن کو شوکت سے مختلف کرتی ہے ورنہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں لاجواب ہیں

قصہ مختصر زیر نظر مجموعہ میں دیکھئے کہ شوکت اپنے بہترین رنگ میں موجود ہے۔ "برقعہ" والا مضمون دیکھئے۔ کوئی کسر اس نالائق لباس کی ہجو میں اٹھا نہیں رکھی۔ برقعہ پوشی کے نام نہاد فوائد کی وہ پول کھولی ہے کہ خدا کی پناہ مگر لطف پہ لطف یہ کہ اپنی بیوی کے برقعہ میں خود بعد میں پناہ لیکر سب "کئے دھرے" کی حضرت نہایت ہی خوبصورتی سے "تلافی بھی کر گئے"۔ پھر ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی نکتہ بھی ظرافت کے ساتھ موجود ہے۔ "چالیسواں" دیکھئے کسقدر عجیب و غریب

رنگ میں شروع ہوا ہے اور اختتام پر کہنے والا سب کچھ کہہ گیا" ہم زلف" اپنی نوعیت کا نرالا مضمون ہے۔ رہ گیا اسپر یہ اعتراض کہ یہ لکھا ہی کیوں گیا۔ تو یہ تو کوئی بات نہوئی۔ خود حضرت معترض کے ایک بہت عمدہ افسانہ کو دیکھکر مجھے بھی یہی کہنا پڑا اور نہ معلوم میرے کتنے افسانوں کو دیکھکر وہ خود بھی اعتراض وارد کر چکے ہوں گے۔

شوکت کے یہاں معمولی واقعات اور باتوں کی بھی بعض جگہ عجیب دلچسپ اسٹڈی موجود ہے مضمون "گھاگرا پار" دیکھئے۔ ریل کے انٹر کلاس میں شوکت اور نسیم ایک ہی برتھ پر لیٹے ہیں مگر کیسے؟ جس طرح بکس میں جوتے رکھے جاتے ہیں۔ یعنی ایک کی ایڑی ایک کا پنجہ اور ایک کا پنجہ اور ایک کی ایڑی ۔۔۔۔" یا پھر اسی مضمون میں صفحہ ۶۲ پر نسیم صاحب کے غزل پڑھنے کی مشق کا بیان جس کمال کے ساتھ کیا ہے کم از کم اور جگہ اسکی نظیر ملنا مشکل ہے اور یہی شوکت کا کمال ہے جو آپکو کسی دوسرے مصنف کے یہاں نہیں مل سکتا شوکت کی یہی مزاح نگاری ہے جسنے شوکت کو شوکت بنا دیا ہے اور اردو اسپر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

قصہ مختصر شوکت کا یہ مجموعۂ مضامین اس قابل ہے کہ اسکی قدر کیجائے اور مجھے اُمید ہے کہ جس طرح اُن کی پہلی دو کتابیں مقبول ہوئیں یہ بھی مقبول ہوگا۔

اس مختصر مقدمہ میں ہندوستان کے سب کے سب مزاحیہ نگاروں کی فہرست دینا میرا مقصد ہرگز نہیں اور اسی وجہ سے میں نے ان مزاحیہ نگاروں کو نہیں لیا ہے جن کی مزاحیہ نگاری سے کہیں زیادہ بہتر خود انکی سنجیدہ تحریریں ہیں اور ان کا اصل رنگ ہی اور ہو۔ ان کا ذکر نہ ہونے سے خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہو کہ وہ کسی طرح بھی مجھ سے کس طرح کم ہیں یا میں نے محض تفریحاً ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

سب کچھ تو میں نے لکھدیا مگر آپ کہیں گے کہ شوکت کی خامیاں اور کمزوریاں بھی ہوں گی، وہ آخر کہاں گئیں؟ تو عرض ہے کہ کوئی ایسا لکھنے والا نہیں جسمیں خامیاں نہوں اور یقیناً شوکت کوئی دیوتا یا فرشتہ نہیں۔ مجھ میں، آپ میں، شوکت میں، سب ہی میں خامیاں بھی ہیں اور اور ظاہر ہے کہ زیر نظر مجموعہ بھی ان خامیوں یا غلطیوں سے خالی نہوگا وہ اور بات ہو کہ میرے لئے ان خامیوں کا پتہ چلانا دشوار ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جو کچھ بھی خامیاں ہیں وہ کہیں چھپا کر نہیں رکھدی گئی ہیں اور اسی مجموعہ میں انکو تلاش کر لیجئے ذرا دقت ضرور ہوگی مگر کوشش شرط ہی خود شوکت صاحب بھی میری دانست میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ (نعوذباللہ) ان کا یہ مجموعہ مضامین بے عیب ہے، مگر بوقت عیب جوئی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہو کہ عیب زیادہ ہیں یا خوبیاں اور اس معیار پر آپ اس مجموعہ کو انشاء اللہ کھرا پائیں گے۔ فقط

من آنم کہ من دانم

میرا ارادہ تھا کہ "سیلاب" کے لئے کچھ عرض حال لکھوں گا۔ لیکن برادرم مرزا عظیم بیگ چغتائی نے مشورہ دیا کہ نہ لکھو لہٰذا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر جب چغتائی صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ شروع سے آخر تک پڑھا تو یہ چند سطریں لکھنا فرض ہو گئیں ورنہ اندیشہ تھا کہ خدا جانے کن کن غلط فہمیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔

چغتائی صاحب نے اس مقدمہ کے ساتھ مجھکو جو خط لکھا تھا اسکے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ " رکھیا عرض حال آپکا تو میری دانست میں دو صفحات سے زیادہ نہو بلکہ بالکل نہو تو اور بھی اچھا ہو آپ عرض حال میں مجھ خاکسار کے اعلیٰ صفات پر کرم نہ فرمائیے گا ورنہ جھپا پلزم ہو کر رہجائیے گی اور بالکل واللہ آرہ اجی واللہ آپ ہو کر رہجائیے گا۔

ان الفاظ کو ملاحظہ فرمانیکے بعد اب ذرا مقدمہ پر ایک نظر پھر سے ڈال جائیے تو آپکو بھی اسی نتیجہ پر پہونچنا پڑیگا کہ چغتائی صاحب نے یہ مقدمہ نہیں لکھا ہو بلکہ میرے لئے ایک مصیبت نامہ لکھدیا ہے۔ ایک اچھے خاصے

آدمی کا دماغ خراب کرنے کے لئے جو جو ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں وہ سب آپکو اس مقدمہ میں ملینگے لیکن یہ بھی بالکل اتفاق ہی سمجھئے کہ خاک پہلے ہی سے اپنے متعلق صحیح اندازہ رکھتا ہو اور اسکو علم ہے کہ خود کتنے پانی میں ہے ورنہ ان حضرت نے تو گویا چوپٹ ہی کر دیا تھا۔

غضب خدا کا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ، جناب پطرس اور مسٹر رشید احمد صدیقی ایسے پہاڑوں سے مجھ جان ناتواں کو ٹکرا دیا گیا ہو اور پھر لطف یہ ہو کہ خود بدولت تو گویا بالکل ہی ذرہ بمقدار بنکر رہ گئے ہیں اور سب سے پہلے مجھ غریب کو اپنے ہی سے ٹکر دی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جناب کا یہ اصرار کہ تم عرض حال نہ لکھو۔ ذرا یہ زبردستی تو ملاحظہ فرمائیے یعنی

"زہر دے اُسپہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا"

لیکن میں اس طرح خاموشی کے ساتھ پاگل بننے کے لئے تیار نہیں ہوں اور ان الفاظ کو میری طرف سے ڈھنڈورہ سمجھا جائے کہ میں دراصل مرزا فرحت اللہ بیگ، جناب پطرس، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے سامنے کسی حیثیت سے بھی مقابلتاً آنیکے خیال کو بھی مزاحیہ قسم کا کفر سمجھتا ہوں۔ اور اس اعتراف کے بعد میں اُن بزرگوں کی خدمت میں معذرت خواہ ہوں جنکی شان میں مقدمہ کے اندر مجھ سے مقابلہ کر کے گستاخیاں کی گئی ہیں۔ حالانکہ بخدا یہ میرا قصور نہ تھا بلکہ اسکی تمام تر ذمہ داری مرزا عظیم بیگ صاحب

چغتائی وکیل چیف کورٹ باردواڑ کے سرہے۔

میں مزاح نگار ضرور ہوں مگر میرے یہ الفاظ مزاح سے قطعاً غیر متعلق ہیں میں شاعر بھی ہوں لیکن میرے اہل انکسار کو شاعرانہ انکسار نہ سمجھا جائے میں لکھنؤ میں رہتا بھی ہوں لیکن میرے ان الفاظ کو لکھنوی تکلف نہ خیال کیا جائے بلکہ مجھکو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کا ایک خالص مرد مسلمان سمجھکر یہ یقین کیا جائے کہ میرے ان الفاظ میں نہ مزاح ہو نہ شاعرانہ انکسار ہو اور نہ لکھنوی تکلف بلکہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہو وہ ایک سیدھی سی سچی بات ہے۔

اگر اب بھی یقین نہ آئے تو شعاع برقیہ سے میرے دل کا معائنہ کر کے دیکھ لیجئے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس، رشید احمد صدیقی اور چغتائی کا میرے دل میں کسقدر احترام ہو۔ میں دراصل ان حضرات کو ایوان مزاح کے چار رکھمبے سمجھتا ہوں اور اسکے آگے آیت کا بھی قائل ہوں۔

"کریپ سول" والے حامد شاہجہانپوری، "مرزاجی" کے مصنف میاں ایم اسلم اور "دُنیا میں جہنم" کے داروغہ آئین سلونوی کا مزاحیہ رنگ بھی مجھکو اس قدر پسند ہو کہ اگر چغتائی صاحب کے آگے آیت نہ آجاتی تو یہ تینوں مزاح نگار بھی اس فہرست میں جگہ پانیکے مستحق تھے البتہ حضور ضیاء الملک گلابی اردو صاحب کے متعلق میں اسلئے کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ آج تو وہ اپنے کو مزاح نگار سمجھ رہے ہیں کل خدا جانے اور کس کس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائینگے

تو میں ہر ایک کی تردید کہاں تک کرتا پھروں گا۔

بہر صورت مقدمہ میں چغتائی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہو سکتی اور اگر آپ بھی کوئی برا مانیں تو یہ واللہ اس کی زیادتی ہوگی اس ذمہ داری کے علاوہ اس مجموعہ کی اور ذمہ داریاں بھی علاوہ اس ذمہ داری کے کہ مضامین تو سب میرے اور سولہ آنے میرے ہیں باقی سب مجھ سے غیر متعلق ہیں، اس تیسری حماقت کی تحریک برادرم نسیم صاحب انہونوی نے فرمائی تھی اور اسکی طباعت ترتیب اور صحت وغیرہ کے ذمہ دار مولوی محمد صدیق صاحب عرف صدیق بک ڈپو صاحب ہیں۔ کتابت لکھنؤ کے مشہور کاتب اور ہونہار شاعر محمد عبدالحمید صاحب حمید صدیقی نے فرمائی ہے۔ کتابت کی عمدگی تو قابل داد ہے مگر ایک جزو فی ہفتہ کی رفتار نے کتاب کو مجموعی طور پر کس قدر تاخیر میں ڈالدیا اسکا حساب بانی ہم کو یاد نہیں لیکن حمید صاحب کی یہ نازبرداری محض حسن کتابت کی وجہ سے کی گئی ہے ورنہ ہو سکتا تھا کہ ع۔

"تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی"

شوکت تھانوی

لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

۲۰ دسمبر ۱۹۳۳ء

تعزیت

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا
کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو
والدین کا غم؟ ماشاء اللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال
فرمایا تھا لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ
جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور اندازہ
ہوتا تھا کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تل جائے تو والدین کا داغ
بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے بیٹے یا بیٹی کے مرنیسے والدین یتیم نہیں ہوتے
لیکن باپ کے مرنیسے اولاد یتیم خانے میں داخل کر دی جاتی ہے۔ اولاد کے
مرنیکے بعد انسان اپنی دوسری اولادوں کو دیکھکر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم
یہ امکان تو ضرور رہتا ہے کہ خداوند کریم اور دیگا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ
ریاض بیچارے اپنے لئے والد کا انتظام کیونکر کرتے۔ اُن کو تو یہی غم تھا
اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں کے غم سے
وہ واقف نہ تھے اسلئے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے
میں دُنیا سے کوچ کر چکی تھیں اور ان کو ان ہی ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے

ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا۔ لہذا اُن کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی جنکو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لئے اُنسے جدا کردیا تھا۔

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود اُن کے لئے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنیکے برابر تھا لیکن اِس سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے اِس لیے کہ بحیثیت دوست کے ہمکو ریاض کے پاس تعزیت کیلئے جانا تھا۔ اُن سے اظہار ہمدردی کرنا تھا جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ لیکن ہم اِس سے قطعًا نا واقف تھے کہ ہمکو اس سلسلہ میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت اتنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہونچاکر تھوڑی بہت مشق کرلیں۔ بہر حال ہم کو اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہوں گے! اسلئے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لئے آچکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر کچھ ہمکو جھجک تھی تو صرف اسلئے کہ خود ہم نے بہ نفس نفیس آجتک یہ رسم ادا نہ کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہی جانا اور تعزیت کرنا تقریبًا ناگزیر تھا۔ لہذا ہم نے اللہ کا نام لیکر اپنے ارادے کو پختہ کرلیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے ذہن پر زور دیکر یکجا کرنا شروع کر دیے۔

"مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے ---- صبر کیجئے ---- جسکی چیز تھی اُسنے لیلی۔

دُنیا کا یہی دستور ہے ------ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہو
کیا علیل ہوئے تھے؟ ہمکو بھی ایکدن اسی راہ پر جانا ہو ------
آج وہ کل ہماری باری ہو ------ خدا بخشے عجیب انسان تھے ----
دلکو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جُدا ہو گئے ------ کوئی نشانی بھی چھوڑی ہے؟
"ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" ---- مگر صبر کیجئے ---- اب رونیسے
کیا ہوتا ہو ---- ہر ایک پہ یہ دن آنیوالا ہو ---- دُنیا سرائے فانی ہو
کیا اخلاق تھا مرحوم کا ہر ایک خوش ------ کبھی نماز قضا نہیں کی ---
خدا نعم البدل دیگا ------ اپنے دل کو سنبھالئے ------ صبر کا پھل
میٹھا ہوتا ہو ------ حسرت اُن غنچوں پہ ہو جو بن کھلے مُرجھا گئے ---
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں --- ابھی تو نہ تھے اُنکے مرنیکے دن
الٰہی عاقبت محمود گرداں ------ چلئے اب وہ دن نوقت ملتے ہیں ،

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہ تھی. لیکن آسان سے آسان کام جبتک انسان کرنے لے اسکے لئے مشکل بنا رہتا ہو. بہرحال اب تو ہم کو اس دشواری سے دو چار ہونا ہی تھا. لہذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کر لیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد ہم "ایکسپرٹ" ہو گئے تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کی حالت کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے گویا یونیورسٹی کے کسی امتحان میں بیٹھنے کے لئے جا رہے ہیں. تمام راستہ بھر

تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخر کار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہو گئی۔

"مجھکو تو کل اطلاع ہوئی، واللہ دل کو یقین نہیں آتا، عجیب سانحہ ہے، عجیب حادثہ ہے، خداوند کریم آپکو صبر دے اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے، کیا علیل تھے؟ ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی، ------
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، صبر کیجئے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، آپکی قسمت میں یہ غم لکھا تھا ----------
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ جسکی چیز تھی اُسنے لیلی۔--
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد"---- صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے،
روحیں آزاد ہوں جسم جو برباد ہوں، ابھی تو نہ تھے اُنکے مرنیکے دن
مرینگے تو سانچے میں ڈھل جائینگے، وہ تو جنت کا اک پھول تھے---
حوروں کی گود میں ہوں گے۔ نمازی، پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق
دوست نواز، غریب پرور، نیک، سچے، فرشتہ صفت، محبت کرنے والے
لایق، پڑھے لکھے، فخر خاندان، مختصر یہ کہ خدا آپکو صبر کی توفیق دے۔
خدا آپکو نعم البدل عطا فرمائے، خدا آپ کا غم غلط کرے مجھکو اطلاع
ہوتی تو شاید کچھ کام آتا مٹی دینے میں شرکت کرتا، نماز جنازہ میں شریک
ہو جاتا، مگر افسوس کہ "آج وہ کل ہماری باری ہے" چلئے اب دونوں وقت
ملتے ہیں۔ السلام علیکم۔

ریاض کے دروازے پر پہونچکر ارادہ ہوا کہ "خط لیجائیے" کی آواز دیں لیکن یاد آ گیا کہ موقع غم کا ہے۔ فوراً اپنا چہرہ اُداس بنا لیا اور مری ہوئی آواز کے ساتھ پکارا" ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا۔ اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لیگیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوڑھے لپیٹے پڑے تھے ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔

"السلام علیکم"

انھوں نے اسکے جواب میں" وا لے کم"۔ اس سا لام" کہکر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا۔ لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا۔ ہم تعزیت کے لئے آئے تھے۔ لہذا ہمکو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دُہرانا شروع کی۔ لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھُلا لئے دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھُولے جا رہے تھے لاکھ لاکھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اُسکی ہر ہچکی خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگتے تھے جب اسی میں بڑی دیر ہو گئی تو ہم نے اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ وہ روتے روتے جان دیے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں، مجبوراً ہم نے طے کر لیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیئے جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہو گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں؟

کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے تھے بس بات شروع ہونیکی دیر تھی، لہذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں، چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ لہذا اسپر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر کا وقت اور وہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزان کل پر آکر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ ہم نے کہا۔ لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کیلئے آئے ہیں اور آدھ گھنٹے سے بُت بنے بیٹھے ہیں۔ لہذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو ازسرنو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپکے والد۔۔۔۔" پھر سوچا کہ اب کیا کہیں؟ کچھ یاد آگیا تو عرض کیا۔

"آپکے والد۔۔۔۔" ہمکو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا مگر ٹھیک ہو وہ بات یہ تھی کہ:-

"آپکے والد۔۔۔۔۔۔۔ آپکے والد۔۔۔۔۔۔۔۔ آپکے والد۔۔۔

خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں جیسے کمبخت گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا۔ لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو۔ لہذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپکے والد۔۔۔۔۔ آپکے والد کا انتقال ہو گیا۔"

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اُس کو انتقال کی خبر میں ہی نے سُنائی ہو، میں پھر خاموش ہو گیا، لیکن ساتھ ہی مجھکو یاد آیا کہ مجھکو خاموش نہ ہونا چاہئے لہذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

"آپکے والد کا انتقال ہو گیا، آپکے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپکو جوار رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی۔ زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپکے والد مرحوم، مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے، صبر کیجئے، اب رونیسے کیا ہوتا ہے اور آپکے والد۔۔۔ آپکے والد۔۔۔۔۔ آپکے والد تھے۔۔۔۔۔ جسپہ گذری ہوئیہ ہی جانے مگر اب نہ روئیے۔۔۔۔ جانے بھی دیجئے۔۔۔۔۔ ہٹائیے بھی اس قصّہ کو۔۔۔۔۔ آپکے والد کا انتقال ہو گیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے خاموش ہو گیا تھا اور گردن جھکائے بیٹھا خاموشی کے ساتھ میرے الفاظ سُن رہا تھا بلکہ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اُٹھا کر میرا منہ بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

باپ بھی دنیا میں عجب نعمت ہی، بہت سے بیچارے اس ارمان میں مَرے جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہونا ہی اچھا ہے۔"

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جملہ کا اُسپر خاص اثر ہوا اُس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر جمادیں میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر پھر کہنا شروع کیا۔

" اب وہ واپس تو آنہیں سکتے، مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہی، ہمکو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھچا نا، یعنی ایک دن اسی راہ پہ جانا ہی، خدا بخشے عجیب انسان تھے، دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ مجھکو تو کل خبر ہوئی، آج وہ کل ہماری بارہی ہی ورنہ مجھکو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرض محال یعنی یہ کہ مٹی میں شرکت ہوجاتی، نمازجنازہ تو ضرور ہوئی ہوگی"

ریاض نے مُنحنی آواز میں جواب دیا۔

"جی ہاں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی۔

میں۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا اور خدا آپکو ضرور صبر دیگا۔ اور قبر کا کیا ہوا ہوگا؟

ریاض۔ عیش باغ کے نئے چمن میں مناسب جگہ لے لی تھی۔

میں ۔ ہاں واقعی اور تم بیچارے کیا کرتے تمھارے حواس خود ٹھیک نہوں گے، دُنیا سرائے فانی ہی کیا اخلاق تھا مرحوم کا، اور بیماری کیا تھی؟
ریاض ۔ ارے بیماری کیا ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہی۔
میں ۔ ہاں صاحب بڑی مہلک بیماری ہی خدا سب کو محفوظ رکھے۔ ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہوا۔ کمبخت ابنوعا لمگیر ہوتی جاتی ہی۔ غم کا پہاڑ پھٹ پڑا۔ بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی؟
ریاض ۔ ایک تو میں ہی ہوں۔
میں ۔ (جلدی سے) تم تو خیر ہو ہی مگر میں نے کہا شاید اور بھی ہوں ارے ہاں کیا تعجب ہی؟
ریاض ۔ جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے۔
میں ۔ وہی مطلب ہی میرا، اور اُن کی بیوہ کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا ہی؟
ریاض ۔ جی ہاں میری والدہ تو عرصہ ہوا یعنی میری پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں جنکے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔
میں ۔ اُن کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیت ایزدی میں ناچارہ، صبر کیجئے اور آپکے والد ماجد کی ماشاء اللہ کیا عمر تھی؟

ریاض ۔ سو سے کوئی پانچ چھ سال اوپر تھے ۔
میں ۔ افسوس صد افسوس ۔ ع
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
ریاض نے مجھکو کچھ اس نظر سے دیکھا گویا میں دُنیا داری کر رہا ہوں اور یہ سب تصنع ہے ۔ مگر میں نے مؤثر انداز میں کہا ۔
"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھکو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے تھے اور محبت کرتے تھے ۔
ریاض ۔ جی ہاں اُن کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا ۔
میں ۔ ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا لایق باپ ساری دُنیا کو دے ، ہر ایک خوش ، کبھی نماز قضا نہیں کی ۔ ابھی تو نہ تھے اُن کے مرنیکے دن ، خدا جانے کسکی نظر کھا گئی تو سب سے بڑے آپ ہیں ؟
ریاض ۔ جی ہاں اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے ۔
میں ۔ گھبرائیے نہیں ، جس خدا نے ان کو اٹھایا ہے وہی آپکی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا ۔ دُنیا سرائے فانی ہے ، عجب ذات شریف تھی مرحوم کبھی نماز قضا نہیں خود اُن ہی کی قضا آ گئی ۔ ع
این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دُنیا کا یہی دستور ہو، دُنیا سرائے فانی ہے۔ ایک آتا ہو ایک جاتا ہے
اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟
ریاض۔ جی ابھی تو نہیں ہوئی۔
میں۔ (بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) بھائی تو اسی سلسلہ میں
اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ۔
ریاض۔ اس کا یہ کونسا موقعہ ہے بھلا؟
میں۔ تو اب اور کون سا موقعہ آئے گا؟
ریاض۔ اب خوش ہونے والا کون ہو جو تھے وہی نہیں رہے
تو اب کیا ہوگی شادی۔
میں۔ ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہیے تھا کہ اس خوشی کو
دیکھکر دُنیا سے رُخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونیوالے ہم لوگ موجود ہیں
خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے جسکی چیز تھی اُس نے لیلی۔ مگر بھائی
شادی میں اب دیر نہ کرو۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

خدا جانے کل کیا ہونیوالا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ۔ ع

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم کو بیچارے آخر کیا بیمار تھے

یہی ناکہ بس قضا آگئی ورنہ کہیں مرنیکے آثار تھے؟ کسی کو شبہ بھی نہ تھا کہ مرجائینگے؟ مگر خدا کی مصلحت اور تدبیر تو وہ جان دیتے تھے اب تم کو کون اس طرح چاہے گا، تمھارا محبت کرنے والا اُٹھ گیا، تم یتیم ہو گئے، تمپر سے والدین کا سایہ اُٹھگیا۔ ع

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لیکر رونا شروع کردیا۔ اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں، تمام الفاظ ختم ہوچکے، کیا اُن ہی کو پھر سے شروع کردوں؟ لیکن اگر اُنھوں نے بعد میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ آخر کار دل نے کہا بس اب بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ مگر پھر دل نے دوسری بات کہی کہ اسطرح روتے ہوئے دوست کو نہ چھوڑو لہذا ہم نے کہا۔

"بھائی رونے کے لئے تو تمام عمر پڑی ہے اور انشاء اللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہکر روتے رہو گے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے تمکو سمجھ سے کام لینا چاہئیے۔"

ریاض کی ہچکیاں سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہوگئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہی کہی کہ "اچھا بھائی اب اجازت دو۔"

ریاض نے کہا۔ "جائیے گا" ہم نے کہا "ہاں"! السلام علیکم

۳۰

ریاض کے یہاں سے آکر مجھکو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوے
کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہئے تعزیت کے لئے روز
چلا جایا کروں۔
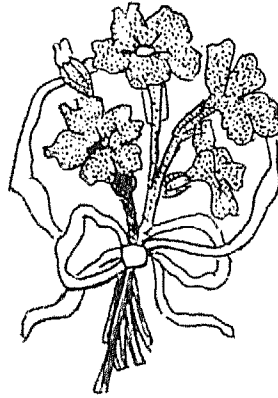
چالیسوان

چالیسواں

اس کو صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کا اکلوتا باپ داغ جدائی
دیجائے کہ باپ کا غم اس اولاد کو کس قدر ہوتا ہے جسکے ایک ہی باپ ہو
اور وہ بھی موت کے بے رحم ہاتھوں اُس سے چھین لیا جائے ہم تو یہ
کہتے ہیں کہ خداوند کریم ہر ایک کو اس "والدینی غم" سے محفوظ رکھے
بخدا جس دن سے ریاض کی یتیمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یہ معلوم
ہوتا ہے کہ خود ہمارا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ اس غریب کا تو جو کچھ بھی حال ہو
کم ہے۔ وہ تو کہئے کہ میں نے بروقت پہونچکر کچھ اس مؤثر طریقہ پر
تعزیت کی تھی کہ اُسکے کچھ آنسو پونچھ گئے ورنہ خدا جانے وہ اپنا کیا
حال کر لیتا۔ لیکن اسکے باوجود اس کی حالت اب بھی دیکھی نہ جاتی تھی۔
چنانچہ وہ غریب میرے پاس عجیب عالم میں آیا اور ایک طرف گردن
جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کہو بھائی ریاض اچھے تو ہو؟
اُسپر اُس نے نہایت ہی افسردہ طریقہ پر کہا:۔
"کیا اچھے ہیں بھائی صاحب والد مرحوم تو ہمکو کسی کام کا
نہیں چھوڑ گئے"

ہم نے جواب دیا "واقعی اُنھوں نے تم کو لاڈ پیار میں نہ پڑھایا نہ لکھایا اور نہ کوئی دستکاری ایسی سکھائی کہ چار پیسہ کما سکتے تم جو یہ کہتے ہو دُنیا میں کسی کام کا نہیں چھوڑ گئے تو سچ کہتے ہو مگر بھائی خدا مسبب الاسباب ہے تمھارے لئے بھی غیب سے کوئی نہ کوئی سامان ہو ہی جائیگا، تم مایوس نہ ہو بس خدا پر بھروسہ رکھو۔"

وہ۔ یہ مطلب نہیں ہے میں تو یہ کہتا ہوں کہ اُنھوں نے مرکر ایسا دل توڑا ہے کہ اب دُنیا سے دل پھر گیا۔"

ہم۔ تم کہتے ہو دل پھر گیا۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمھارا دماغ بھی پھرا ہوا سا معلوم ہوتا ہے مگر بھائی دل کو بھی سنبھالو اور دماغ کو بھی، نماز پڑھا کرو شادی کرلو، بچے ہوں گے اور تم خود باپ بن جاؤ گے۔

وہ۔ خیر ان باتوں کی طرف تو اب خیال بھی نہیں جاتا اب تو یہ دُعا کیجئے کہ ہم بھی اُنھیں کے پاس پہنچ جائیں۔

ہم۔ تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمھارے لئے دُعا نہیں کرتا بخدا ریاض حاضر غائب تمھارے لئے دل سے دُعا نکلتی ہے۔

وہ۔ میں اسوقت اسلئے حاضر ہوا تھا کہ بارہ تاریخ کو چالیسواں ہے آپ کو اطلاع کردوں۔

ہم۔ ارے بھائی اس میں اطلاع کرنے ہی کی کونسی بات تھی ہم تو خادم

ہیں بسروچشم حاضر ہوں گے اور جو خدمت ہمارے لائق ہو ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔

وہ۔ بس آپکے لائق خدمت یہی ہو کہ بھولئے گا نہیں اور اب مجھے اجازت دیجئے۔

"تمنے بھی کمال کیا ہم بھول سکتے ہیں"

کہتے ہوئے ہم بھی کھڑے ہوگئے اور ریاض بھی کھڑا ہوگیا ہم نے اسکو رخصت کیا اور اسکے بعد ہی سے ہمکو چالیسویں کی فکر پیدا ہوئی کہ یہ دعوت تو ہم نے قبول کر لی ہو مگر ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ چالیسویں میں کیا ہوتا ہو اور ہمکو شریک ہو کر کیا کیا کرنا چاہئے۔ لیکن پھر ہم نے خود ہی سوچا کہ تعزیت سے بھی ہم بالکل اسی طرح بے بہرہ تھے لیکن جس حسن و خوبی کے ساتھ ہمنے اس فرض کو انجام دیا ہو اگر کوئی دیکھتا تو یہی کہتا کہ شاید ہم عمر بھر بس تعزیت ہی کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح انشاءاللہ چالیسویں کی بھی مشکل آسان ہوجائیگی جب تک انسان کوئی کام نہیں کرتا ہو اسکو بہت دشوار معلوم ہوتا ہو لیکن جہاں سابقہ پڑا کہ سب کچھ خود بخود آسان ہوجاتا ہو اب یہی دیکھئے کہ تعزیت کرنا ہمارے لئے کسقدر مشکل کام تھا لیکن آج ہم ہیں کہ اس سے زیادہ آسان کام اور کوئی سمجھتے ہی نہیں۔ اسی طرح چالیسواں ہمارے لئے اسوقت تک ایک دشوار مرحلہ تھا جبتک کہ ہمپر سے وہ وقت گزر نہ گیا، اس کے بعد تو پھر

جسطرح تعزیت حلوہ ہوکر رہگئی چالیسواں بھی بائیں ہاتھ کا کھیل بنکر رہجائے گا
لیکن ایک سوال تھا کہ تعزیت کیلئے ہمارے پاس پہلے سے کچھ مواد موجود تھا۔
تعزیتی الفاظ کانوں میں پڑے ہوئے تھے۔ بس انکو ترتیب ار بیان کردینا
تھا اور بہت سے تعزیتی الفاظ ان خطوط سے مہیا کر لئے تھے جو کسی کسی کے
مرنیکے سلسلے میں آچکے تھے مگر چالیسواں ہمارے لئے بالکل نئی چیز تھا۔ نہ اسکے
متعلق ہمارے پاس کوئی مواد تھا اور نہ چالیسویں کے سلسلہ میں ایسے خطوط
دستیاب ہوسکے جن سے کچھ حاصل کیا جاسکتا بس ہمکو اتنا معلوم تھا کہ اُسدن
بھی عام تقریبوں کی طرح دعوت ہوتی ہے لوگ پلاؤ کھاتے ہیں اور اپنے گھر
چلے آتے ہیں مگر دل کہتا تھا کہ پلاؤ کھانیکے علاوہ بھی کچھ اور ضرور ہوتا ہوگا
بہرحال ہم نے اس مسئلہ کا یہ حل تلاش کیا کہ اُسدن جو کچھ اور لوگوں کو کرتا ہوا
دیکھیں گے وہی ہم بھی کرینگے اس سے زیادہ ہمارے امکان میں اور کچھ نہ تھا۔

چالیسویں کو پورا پورا ایک ہفتہ باقی تھا اور یہاں یہ حال کہ نہ تو کوئی
شیروانی اس قابل کہ کسی تقریب میں پہن کر جاسکیں نہ جوتا ایسا تھا کہ شرفا کی
محفل میں جانیکے قابل ہوا اور پھر یہ معلوم تھا کہ ریاض کے یہاں کی محفل کیسی ہوگی تمام
بڑے بڑے رئیس اور حکام شرکت کریں گے۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ایک شیروانی کا
انتظام ہوجائے اور ایک جوتا خرید لیا جائے چنانچہ ہم نے سب سے پہلے ایک شیروانی کا
کپڑا جو شادی بیاہ چالیسویں روزہ کشائی وغیرہ میں کام آسکے۔ اور اسی قسم کی

تقریبوں میں پہن کر جانے کے لائق ہو خریدا اور درزی کو دیدیا اُسکے بعد ایک وارنش کا پمپ معہ ریشمی موزوں کے خرید لائے سُرخ رنگ کا ریشمی رومال موجود ہی تھا لہذا حسب ضرورت تمام چیزوں کا انتظام ہو گیا اور اس انتظام سے فارغ ہونے کے بعد ہمکو چالیسویں کا اسی طرح انتظار رہنے لگا جس طرح عید کے کپڑے درست کرنے کے بعد لوگوں کو عید کا انتظار ہوتا ہے تاکہ کسی طرح یہ کپڑے پہن کر انکو کام میں لے آئیں ہر روز دن میں ایک آدھ مرتبہ اپنے جوڑے کو دیکھکر یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ چالیسویں کی محفل میں بس ہم ہی ہم ہوں گے اور سچ پوچھئے تو اسی مقصد کے لئے اپنی اہم ضروریات کو ٹالکر یہ جوڑا تیار کرایا تھا۔ البتہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ریاض کے والد کے چالیسویں میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں اور اگر کہیں ہم ہی ہم رہے تو دام وصول ہو جائینگے۔

انتظار کی گھڑیاں گو مشکل میں گزرتی ہیں، لیکن گزرتی ضرور ہیں، ہم کو چالیسویں کا انتظار صرف چار ہی پانچ روز کرنا پڑا مگر معلوم ہوتا تھا کہ چار پانچ برس سے اس دن کے منتظر ہیں۔ چنانچہ چالیسویں کے دن ہم طلوع آفتاب سے قبل بیدار ہو کر شرکت کے انتظامات میں مصروف ہو گئے سب سے پہلے تو چراغ رکھکر داڑھی کو صاف نہیں کیا بلکہ گھونٹا اسکے بعد پیرس سوپ مل کر خوب نہائے اور کپڑے بدلے عطر لگایا، بال سنوائے، کریم وغیرہ سے چہرے پر پالش کی اور پھر شیروانی اور چمکدار پمپ کو پہن کر ریشمی رومال ہلاتے ہوئے اسطرح چلے

گویا ریاض کے باپ کا چالیسواں نہیں بلکہ ہماری شادی تھی بات یہ تھی کہ ہم جانتے تھے کہ ریاض کے یہاں بڑے بڑے لوگ شرکت کریں گے اور اس محفل میں ہم کو بھی کسی سے کم نہ رہنا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے کرایہ کے موٹر پر سوار ہوکر ریاض کے گھر کا رُخ کیا اور ریاض کے دروازے تک پہونچنے سے قبل ہی موٹر والے کو اسلئے کرایہ دیدیا کہ وہاں کرایہ دیتا دیکھکر لوگ سمجھ جائینگے کہ کرایہ کا موٹر ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جسوقت ہمارا موٹر ریاض کے دروازہ پر پہونچا وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا جو ہم کو موٹر پر سوار اور موٹر سے اُترتا دیکھتا اسی انتظار میں ہم نے موٹر ٹھہرنے کے بعد بھی دو چار منٹ اُسی پر تشریف رکھی۔ لیکن جب موٹر والے نے جلدی کی تو مجبوراً گردن جھکا کر اُترنا ہی پڑا اور ہم نہایت تعاقدارانہ انداز سے ریاض کے گھر میں داخل ہوئے جہاں اتفاق سے ریاض کے مکان کے بڑے ہال میں جھاڑو دی جا رہی تھی ہم سمجھے کہ شاید چالیسویں کے لئے ریاض نے کوئی علیحدہ مکان لیا ہے یا کوئی پنڈال وغیرہ بنوایا ہے لیکن ریاض نے جو جاروب کشوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ "آئیے آئیے" کہکر ہم کو وہیں بلا لیا اور ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا:۔

"آپنے اچھا کیا جلدی چلے آئے بہت کچھ کام نکل جائے گا۔"

ہم نے بھی سوچا کہ احسان جتانے کا اچھا موقعہ ہے۔ برجستہ عرض کیا:۔

" مجھکو خود معلوم تھا کہ تم تنہا انتظام نہ کرسکو گے لہذا میں آ گیا ہوں اب بتاؤ کہ نشست کا کیا انتظام کیا ہے اور کھانا کہاں کھلاؤ گے۔ محفل کہاں ہوگی؟

ریاض۔ نشست بھی اسی ہال میں ہوگی اور کھانا اسکے پشت والے کمرہ میں کھلاؤں گا۔ ابھی ہم آپ مل کر اسکو صاف کرائے لیتے ہیں۔

" ابھی ہم آپ مل کر اسکو صاف کرائے لیتے ہیں " یہ جملہ ہمارے لئے قابل غور تھا اور اسکے معنی یہ تھے کہ گویا ہماری شیروانی ہمارا جوتا ہمارے موزے وغیرہ سب اسی صفائی کے نذر ہو جائینگے۔ ارادہ کیا کہ آنکھ بچا کر گھر کی راہ لیں مگر ہمت نہ ہوئی پھر سوچا کہ پیروں میں درد یا ہاتھ میں زخم وغیرہ کا بہانہ کریں مگر بہانہ تراشنے سے قبل ہی ریاض نے پھر کہا۔

" تو چلئے اُس کمرہ کی خبر لیں "

اور ہم کو مجبوراً اُسکے ساتھ جانا ہی پڑا مگر ہم نے حواس بجا رکھکر پہلے تو شیروانی اُتار دی پھر جوتے احتیاط سے رکھکر موزے اُتار ڈالے اور پھر اطمینان کے ساتھ کمرہ کی صفائی میں مصروف ہوگئے اور تھوڑی ہی دیر میں کمرہ صاف کرکے درست کر دیا اُدھر ہال ٹھیک ہو چکا تھا اور لوگ آنا شروع ہو گئے تھے لہذا ہم نے سب سے پہلے تو ہاتھ منھ دھویا اور پھر اپنا جوڑا پہن کر ہال میں اسطرح آکر بیٹھ گئے گویا اب قاضی صاحب ہم سے " قبول ہے " ؟ دریافت ہی کرنیوالے

ہیں۔ تمام محفل کی نظریں ہماری طرف تھیں اور ہمکو احساس ہو رہا تھا کہ شیروانی رنگ جما رہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی تھا کہ فرشی محفل میں ہمارے جوتے کو رنگ جمانے کا موقع نہیں ملا، لوگ ہماری طرف دیکھکر آپس میں غالبًا یہ سرگوشیاں بھی کر رہے تھے کہ " دیکھئے یہ شخص کتنا نیک مزاج ہے کہ ہمارے ایسے پست اقوام کے لوگوں میں بیٹھا ہوا ہے اور اپنے عالی مرتبہ ہونیکا ذرا بھی غرور نہیں" بعض لوگ ہماری سادگی پر تبسم بھی فرما رہے تھے لیکن ہم جانتے تھے کہ سب کچھ ہماری شیروانی کی بہار ہے اور افسوس ہے کہ یہ لوگ جوتا نہیں دیکھ سکتے۔ کاش یہ کرسیوں کی محفل ہوتی!

لوگ آتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد کھانے کے کمرے میں بلائے جاتے تھے مگر ہم اب تک یہی دیکھ رہے تھے کہ آنے اور کھانے کے علاوہ یہ لوگ اور کونسی بات کرتے ہیں جو ہم کو نہیں معلوم ہے اور جو ہم کو بھی ان سے سیکھ کر کرنا چاہئے۔ مگر معلوم ہوا کہ چالیسویں کے معاملہ میں سب ہماری طرح جاہل مطلق ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے شروع سے آخر تک ایک ایک شخص کی نقل و حرکت کا غائر مطالعہ کیا مگر کوئی بات غیر معمولی سمجھ میں نہ آئی۔ آخر ہم بھی آخری ٹکڑی کے ساتھ دستر خوان پر پہونچ گئے اور نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے سے فراغت کر کے ایک پرانی وضع کے بڑے میاں کے ہمراہ محض اسلئے ہو گئے کہ یہ بزرگ آدمی ہیں تمام عمر چالیسویں کی

تقریب میں شرکت کرتے ہوئے گزری ہوگی اور ان سے زیادہ چالیسویں کے رسوم سے اور کوئی شاید واقف نہو، مگر اُنھوں نے بھی سوائے اسکے اور کچھ نہ کیا کہ کھانا کھاکر ہاتھ دھوئے، خلال کی، پان کھایا اور "السلام علیکم" کہکر رخصت ہوگئے، گویا اُنسے بھی کوئی مدد نہ مل سکی اور یہ بھی باوجود اس سن شریف کے بالکل کورے ثابت ہوئے۔ مجبوراً ہم نے بھی طے کرلیا کہ بس چلے جائیں مگر یہ ایک مہمل سی بات تھی۔ اگر ریاض کا مقصد محض کھانا کھلانا تھا تو چالیسواں ہی کیوں کیا یوں ہی دعوت کر دیتے تو لوگ کھانا کھانے آجاتے بہرحال ہم کو یقین تھا اور یقین کامل تھا کہ کچھ اور ہوتا ضرور ہوگا مگر کیا ہوتا ہوگا۔ اس کا علم نہ تھا ہم ابھی غور و فکر میں تھے کہ ریاض خود ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا:-

"کہئے بھائی صاحب کوئی خامی تو نہیں رہی؟"

ہم۔ نہیں بھائی خامی کیسی، پلاؤ بھی خوب پکا تھا، ایک ایک چاول گلا ہوا تھا۔ شیرمالیں بھی خوب سکی ہوئی تھیں، خامی کا کیا سوال ہے؟

ریاض۔ بات یہ ہے کہ اول تو مجھکو تجربہ نہیں دوسرے حواس ہی بجا نہ تھے خدا جانے کس طرح یہ سب کچھ کیا؟

ہم۔ میاں بخدا تم مستحق مبارکباد ہو کہ ماشا اللہ خوب انتظام کیا اور بڑے حوصلے کے ساتھ اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔

ریاض۔ یہ سب آپ ہی لوگوں کے قدم کی برکت تھی۔

ہم۔ نہیں واللہ میں منہ دیکھی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ تم نے نہایت سیر چشمی سے کام لیا۔ خداوند کریم تمکو ہمیشہ یہ خوشیاں نصیب کرے۔

ریاض نے میری تعریف پر کچھ متعجب ہو کر میرا منہ دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

"خدا نہ کرے کہ ایسی خوشی مجھکو دیکھنا نصیب ہو میرا تو کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔

ہم۔ سچ کہتے ہو۔ واقعی یہ تقریب بھی تمہارے لئے ایک مستقل صدمہ ہے اب تمکو ہر وقت چچا جان کا خیال ہوتا ہوگا کہ وہ زندہ ہوتے تو آج کسقدر خوش ہوتے افسوس کہ اُن کی قسمت میں یہ تقریب دیکھنا نہیں لکھی تھی۔ مگر بھائی سچ کہا ہے کسی نے کہ ع

"چرچے یہی رہینگے افسوس ہم نہونگے"

وہ۔ کچھ نہ پوچھئے کہ میرے دل کا کیا عالم ہے کسی وقت بھی والد مرحوم کا خیال ذہن سے نہیں نکلتا۔

ہم۔ جی یہ اور ستم ہے کہ وہ خود تو سدھار گئے مگر اپنا خیال چھوڑ گئے اب بتائیے کہ اُن کے سدھارنے سے فائدہ ہی کیا ہوا؟

وہ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

ہم۔ خیر یہ تو اچھا ہے کہ تم کو یہ یقین ہو جائے کہ ہمارے باپ ہی نہ تھے کاشکے واقعی تم ہمیشہ سے بے باپ کے ہوتے؟

وہ۔ بھائی مجھکو تو گھر کاٹے کھاتا ہو۔ مجھ سے یہ ویرانی نہیں دیکھی جاتی۔
ہم۔ تو اسی لئے کہتا ہوں کہ تم اپنا گھر بساؤ شادی کرو۔ دُلہن کو لاؤ،
باپ تو اب تم کو مل نہیں سکتا۔ اگر یہ بھی کوئی ملنے والی چیز ہوتی تو
ایک کیا ہزاروں حاصل کرلئے جاتے مگر اب تو سوائے صبر کے اور کوئی چارہ
ہی نہیں ہو۔ اب بہتر یہی ہو کہ تم باپ کی جگہ پر دُلہن کو لے آؤ۔
وہ۔ میرا اب کچھ دل نہیں چاہتا۔
ہم۔ تو بھائی جو ترکیب تم بتاؤ وہ میں کروں۔
وہ۔ ارے اب ترکیب ہی کیا ہوسکتی ہو؟ جو کچھ ہونا تھا ہوگیا۔
ہم۔ تم ہی جانو اب جب ایک بات ہوگئی تو جہنم میں ڈالو۔ بھول جاؤ۔
دوسری طرف دل لگاؤ۔

وہ کچھ آبدیدہ سا ہوگیا اور میں اس خیال سے گھبرایا کہ کیا آج پھر
مجھکو تمام تعزیتی الفاظ دُہرانا پڑیں گے مگر اُس نے فوراً ہی ٹھنڈی
سانس لیکر کہا۔ "یا اللہ تیرا شکر ہو"

اور ہم نے اس کو راہِ راست پر آتا دیکھکر فوراً کہا۔
"ہاں بس یہی کہو کہ خدا کا شکر ہے کہ اُن کا انتقال ہوگیا۔ اسطرح
سمجھانے سے دل کو صبر آسکتا ہے۔"
اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ

اب کسی طرح پیچھا چھڑانا چاہئے۔ وہ گردن جھکائے ہوئے رٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں بھاگنا چاہتا تھا کہ یک لخت میرے منہ سے نکل گیا۔

"اچھا بھائی ریاض تو اب چلدیے"

اُس نے "جائیے گا؟" کہکر منہ اُٹھایا اور ہم اسکو چالیسویں کی مکرر مبارکباد دیتے ہوئے گھر سے نکل آئے۔ اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ چالیسواں تو تعزیت سے بھی زیادہ آسان چیز ہے۔ یعنی بس گئے کھانا کھایا، اور چلے آئے، اس حساب سے تو گویا ہر دعوت چالیسویں کی دعوت ہوسکتی ہے۔ اگر ہمکو پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو ہم خواہ مخواہ ہرگز یہ فکر نہ کرتے کہ خدا جانے چالیسویں میں کیا واردات ہو؟
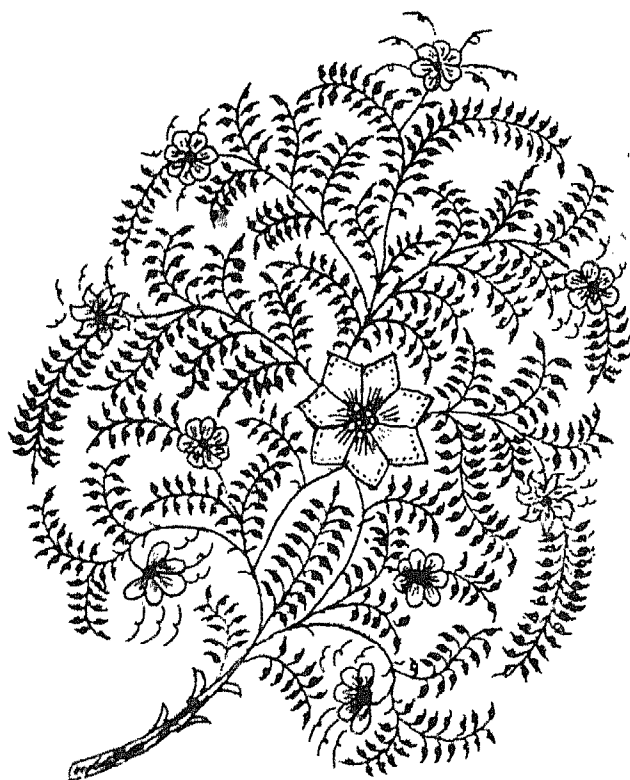
ہم زلف

ہم زلف

"پہرے کہیں کے"
بھرے چوک میں جب کوئی شخص اس بے تکلفی کے ساتھ شانہ پر ہاتھ رکھدے تو اسکے معنی یہی ہوئے کہ وہ یقیناً اس بے تکلفی کا مستحق ہو گا۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجئے جو ہم ان حضرت کو جانتے بھی ہوں جنھوں نے ہم کو بہرہ بھی بنایا تھا۔ اور بھرے بازار میں کندھے پر ہاتھ بھی رکھا تھا۔ ہم تو ان کو پہچاننے کی کوشش میں تھے لیکن وہ برابر نہایت بے تکلفی کے ساتھ ہمکو اپنا جملہ حقوق محفوظ قسم کا عزیز سمجھے جاتے تھے اور اپنے ہر انداز سے یہ ثابت کر رہے تھے کہ ہمارا اور انکا رشتۂ تکلف اور دنیا دی مراسم سے بالاتر ہے چنانچہ انھوں نے ہمکو اپنی طرف کھینچ کر نہایت پیار سے کہا۔

"خدا کی قسم تم ہو بڑے بے مروت یعنی کبھی تو بھول کر ہم غریبوں کو بھی یاد کر لیا کرو۔"

ہم ابتک یاد نہ کر سکے کہ یہ ہیں کون بزرگ اور ان سے ہمارا کیا رشتہ ہے۔ اگر ہم صاف صاف یہ کہے دیتے ہیں کہ ہم نے آپ کو

نہیں پہچانا تو ممکن ہے بُرا مان جائیں اسلئے کہ ان کے برتاؤ سے تو کم از کم یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اور ان کے درمیان جو رشتہ ہے وہ کم از کم بھولنے والا نہیں ہے لیکن سوال یہ تھا کہ جب ہم ان حضرت کو جانتے ہی نہ تھے تو اسکی ہمکو کیا خبر ہو سکتی تھی کہ ان سے رشتہ کیا ہے اور اس علم کے بغیر ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم ان کو کس رُخ سے مخاطب کریں اور گفتگو کا کیا طریقہ رکھیں لیکن بہت کچھ غور کرنیکے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو ہم یہ تو ہرگز نہ کہیں گے کہ ہم نے آپکو نہیں پہچانا۔ البتہ ہم ان سے گفتگو میں یہ احتیاط ضرور رکھینگے کہ ہماری لاعلمی ثابت نہو، ہم تو خیر اس اُدھیڑ بن میں پڑے ہوئے تھے لیکن وہ چونکہ ہمکو پہچان چکے تھے لہذا انھوں نے نہایت آزادی کیساتھ ہم سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔

"بھائی بات اصل میں یہ ہے کہ تم بھی اپنے کاموں میں مصروف ہو اور ادھر ہمکو بھی دم لینے کی مہلت نہیں مگر بھائی ایسا بھی کیا کبھی کبھی تو صورت دکھا دیا کرو۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہزاروں کوس کے فاصلہ پر ہیں۔"

ہم نے سنبھلتے ہوئے عرض کیا "بھائی صاحب بات یہ ہے کہ فرصت سے سب کچھ ہوتا ہے۔

کہنے لگے "یہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ اپنے افکار جب چھوڑیں تو عزیز رشتہ دار بھی یاد آئیں! ۔نہیں تو کیسے عزیز اور کیسے کچھ گھر ہی کے جھگڑوں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔

ہم نے پوچھا۔
"اچھا گھر میں سب خیریت تو ہے؟"
کہنے لگے ۔

"ارے بھائی کیا خیریت پوچھتے ہو۔ اپنی سالی کے متعلق تو تم جانتے ہی ہو کہ ہمیشہ کی مریض ہیں۔ بخدا جس دن سے شادی کر کے لایا ہوں آج تک تو ان کو تندرست دیکھا نہیں رہ گئے، بچے اُنکا کیا پوچھنا۔ بیمار ماں کے بچے بھی قابل رحم ہوتے ہیں۔"

اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہمارے ہم زلف ہیں۔ ہم نے اپنے عزیزوں پر خیال دوڑایا۔ لیکن ان میں بھی ان ہم زلف صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا ہم نے سوچا کہ یہ حقیقی ہم زلف نہیں۔ کسی رشتہ کی سالی کے شوہر ہوں گے بہرحال ہیں ضرور ہم زلف، لہذا ہم نے جوابدیا۔

"ہاں صاحب ان کی صحت تو ہمیشہ سے خراب ہے۔ خداوند کریم ان کو صحت عطا فرمائے۔"

کہنے لگے "ایک دن کی بیماری ہو تو کہا جائے ہم ان کو ہمیشہ سے

بیمار او راپنے کو تیماردار دیکھ رہے ہیں۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے والدہ صاحبہ کے بھی بس آخری دن سمجھو۔

ہم۔ ابھی خدا نہ کرے ان کا دم بھی غنیمت ہے خداوند کریم ان کا سایہ ہم سب پر قائم رکھے۔

وہ۔ نہیں بھائی اب تو ہم دُعا مانگتے ہیں کہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو جائے ان کی تکلیفیں اب دیکھی نہیں جاتیں۔

ہم۔ اللہ رحم کرے۔

وہ۔ سنا تھا کہ تمھارے گھر میں بھی کچھ طبیعت ناساز ہے۔ اب کیا حال ہے؟

ہم۔ بفضلہ اب تو اچھی ہیں سب کو یاد کرتی ہیں۔

وہ۔ خود ان کی بہن بھی ان کو دیکھنے کے لئے بیقرار ہیں۔ کسی دن تم ہی لے آؤ۔ اور ہاں وہ محمودہ کا کیا حال ہے؟

یہ نام ہمارے لئے بالکل نیا تھا۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ کون محمودہ؟ لہذا ہم نے جواب دیا "اچھی ہیں وہ بھی"۔

وہ۔ اچھا میری طرف سے پیار کرنا اور کہدینا کہ تیرا خالو تجھ سے خفا ہے۔ تو نے اُسکو کبھی خط بھی نہ بھیجا۔ جیتی رہے اللہ کرے۔

ہم۔ ہنس کر چپ۔

وہ۔ ارے بھائی اور بھی کچھ سنا کہ محسن بھائی کی بیگم صاحبہ کیا رنگ لائیں۔

ہم۔ (حیرت سے) کیا ہوا۔ کیا ہوا؟ ہم نے کچھ نہیں سنا۔
وہ۔ (چپکے سے) خاندان بھر کی ناک گویا جڑ سے اُڑا دی اُسکے تو ڈھنگ
اول دن ہی سے ایسے تھے کہ خود تم نے کہا تھا کہ خدا خاندان کی عزت
رکھ لے چنانچہ وہی ہوا کہ پہلے تو گھر ہی میں خاندان کا نام ڈبویا لیکن آج
چار دن سے بالکل لاپتہ ہیں کیا کہا جائے واللہ مرجانے کو جی چاہتا ہے۔
ہم۔ مگر کچھ شبہ بھی ہے کہ آخر گئی کہاں؟
وہ۔ ارے بھائی شبہ کیا بلکہ یقین ہے لیکن زبان سے نہیں نکلتا جہاں تک
خیال ہے اسی درزی کے یہاں ہیں جس سے بہت دنوں سے پینگ بڑھے
ہوئے تھے اب بتاؤ کہ یہ بات زبان سے نکالنے والی ہے مگر خدا کے لئے
اپنے ہی تک رکھنا۔
ہم۔ توبہ ہے۔ واقعی توبہ کرنے کا مقام ہے کیا اس کمبخت نے خاندان
کی عزت پر پانی پھیرا ہے۔
وہ۔ مگر ہمارے بھائی صاحب قبلہ کو دیکھئے کہ گویا کوئی بات ہی نہیں اور
کوئی ہوتا تو سنکھیا کھا لیتا۔
ہم۔ اس چڑیل کی ناک کاٹ لینا چاہئے تھی۔
وہ۔ تم ناک کہتے ہو میں کہتا ہوں گردن مار دینا تھی۔
ہم۔ کاش کہ یہ دن آنے سے پہلے طلاق ہی دیدی ہوتی۔

وہ۔ کیا کیا جائے بھائی ہمارا تو یہ حال ہے کہ محلہ میں کسی سے آنکھیں چار کرنیکے قابل نہیں رہ گئے۔ ہر ایک یہی کہیگا کہ یہ اغوا شدہ بھاوج کے دیور ہیں۔

ہم۔ واقعی تمھارے لئے بھی مرجانے کا مقام ہے۔

وہ۔ کیا کریں موت سے مجبور ہیں۔ ورنہ اس زندگی سے تو موت واقعی اچھی تھی۔

ہم نے گفتگو کا رُخ بدلنا چاہا اسلئے کہ اس غریب کی شرمندگی سے اب ہم کو بھی تکلیف ہورہی تھی۔ لہذا ہم نے کہا "خیر بھائی چھوڑو اس قصہ کو اب یہ بتاؤ کہ آجکل آمدنی کا کیا حال ہے؟"

کہنے لگے۔ "آمدنی کیا وہی گنی بدنی بندھا ٹکورا پہلی تاریخ کو مقررہ تنخواہ بالائی آمدنی کا پتہ نہیں اور تم تو کہو دکان کیسی چل رہی ہے؟"

ہمارے باوا آدم سے لیکر ابتک کسی نے بھی دوکان نہیں رکھی تھی لہذا اس سوال کا کیا جواب دیسکتے تھے لیکن چونکہ ہمارے ہم زلف نے یہ سوال کیا تھا لہذا ظاہر ہے کہ سوال غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہم نے جواب دیا۔ "آجکل بڑے سناٹے ہیں"

وہ۔ آجکل ہر کاروبار کا یہی حال ہے، پھر کپڑے کی تجارت تو واقعی آجکل ٹھنڈی پڑی ہے۔

معلوم ہوا کہ ہماری دوکان کپڑے کی ہے۔ لہذا ہم نے کہا:-
" تمام دن ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں۔ اول تو گاہک آتے نہیں اور آئے بھی تو کانگریس کے والنٹیر آنے نہیں دیتے۔ اب دن بھر کے بعد تھکے ماندے گھر جا رہے ہیں۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو۔ بلکہ اور گرہ سے خرچ ہو جاتا ہے۔

وہ۔ اچھا بھائی اب جاؤ گھر میں آرام کرو۔ تم سے مل لئے۔ بڑی خوشی ہوئی مگر کسی دن گھر پر ضرور آؤ۔ تمہاری سالی کہا کرتی ہیں کہ اقتدار بھائی نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔

اب تو ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم اقتدار بھائی ہیں۔ لہذا دل چاہا کہ کہہ دیں ہم اقتدار بھائی نہیں ہیں لیکن پھر ہم نے سوچا کہ غریب بہت شرمندہ ہوگا۔ اگر اسکورات کے وقت مغالطہ ہوا ہے تو تم بھی ہم زلف بنے رہو۔ رشتہ ایسا ہے کہ کسی طرح گھاٹے میں نہیں ہو۔ لہذا ہم نے کہا۔

" اچھا بھائی سلام علیکم "

ہمارے راہگیر ہم زلف صاحب نے بھی خدا حافظ کہا اور چل دیے۔

خیریت یہ ہوئی کہ ہمارے کسی شناسا نے ہمارا نام لیکر نہیں پکارا لیکن ہمیں بھی کوئی مضایقہ نہ تھا ہم کہہ دیتے کہ یہ ہمارا تخلص ہے۔

آرام کرسی

آرام کرسی

خداوند کریم بس اتنا روپیہ دیدے کہ انسان ایک آرام کرسی خرید لے
پھر تو چاہے گھر میں جگہ ہے ڈیڑھ ہلیں یا پیٹ پر پتھر باندھا جائے لیکن
آرام کرسی خواہ مخواہ بڑا آدمی بنا دیتی ہے اور آرام کرسی والا دنیا کی
نظروں میں معزز ہو کر رہتا ہے۔ خدا نے آرام کرسی کو عجیب شرف بخشا ہے
کہ خود تو وہ خیر سب کرسیوں سے ممتاز ہوتی ہی ہے لیکن اسپر بیٹھنے والا
بھی صدر منتخب نظر آنے لگتا ہے یہ اور بات ہے کہ دوسرے کے گھر جاکر
اسکو آخر کار اپنی اوقات پر اس طرح آنا پڑتا ہے کہ صاحب خانہ آرام کرسی پر
دراز ہوتے ہیں اور وہ معمولی کرسی پر بیٹھنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔
لیکن خود اپنے گھر پر تو اس کو یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے کہ آرام کرسی پر
نہایت شان سے خانہ ساز خلد اللہ ملکہ بنے پڑے ہیں اور باقی تمام
آئے گئے نہایت ادب سے حلقہ کئے ہوئے چاروں طرف بیٹھے ہیں اسوقت
آرام کرسی پر بیٹھنے والے کو اپنی قدر و قیمت خود معلوم ہوتی ہے
اور اپنے عالی مرتبہ ہونے کا خود احساس ہونے لگتا ہے جسکے بعد
قدرتی طور پر ایک شان ایک دبدبہ ایک رعب ایک ٹھاٹ اور ایک وجاہت

پیدا ہو جاتی ہو. خواہ ان باتوں سے ایک بات بھی غریب کو عمر بھر نصیب نہوئی
ہو. لیکن یہی کیا کم ہو کہ جبتک وہ آرام کرسی پر لیٹے گا یہ تمام چیزیں اسمیں
اس طرح موجود رہیں گی گویا خاندانی خصوصیات میں سے ہیں. یہی وجہ ہو کہ
تہذیب جدید نے اس بات کی اجازت دیدی ہو کہ ہر صاحب خانہ اپنے
دولت خانہ یا غریب خانہ میں جہاں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے چھ سات
معمولی کرسیوں کا انتظام کرے وہاں اپنے لئے ایک آرام کرسی کا بھی
انتظام ضرور کرے تاکہ جسوقت اُسکے دوست احباب یا دوسرے ملنے والے
اُسکے گھر میں آئیں وہ بحیثیت میزبان کے اُن کو تو معمولی کرسی پر بٹھادے
اور خود مہمانوں کے سامنے ٹانگیں پھیلا کر اس انداز سے آرام کرسی پر
پڑ رہے کہ "ہمارا گھر ہے ہم آرام کرسی پر لیٹے ہیں. کسی کے باپ کا اجارہ
ہے تمکو اگر غرض ہو تو معمولی کرسیوں پر بیٹھو ورنہ اپنے گھر کا راستہ لو"
وہ اپنے مہمانوں کی ہر ممکن خاطر تواضع کرے گا، پان دیگا، سگرٹ
پلا دیگا، چائے یا شربت سے تواضع کرے گا، مگر آرام کرسی کے معاملہ میں
وہ مروت کو دخل نہیں دیگا اور اپنے استحقاق کو کبھی قیمت پر بھی ہاتھ سے
نہ دے گا. اسکے مہمان معزز نہیں لاٹ صاحب ہی کیوں نہوں اپنے
بزرگ نہیں باپ دادا ہی کیوں نہوں مگر وہ اپنی آرام کرسی پر ٹانگیں
پھیلائے پڑا رہے گا اور اُسکے مہمان حاشیہ نشینوں یا مریدوں

یا حلقہ بگوشوں یا حکیم کے مطب کے مریضوں یا مکتب وغیرہ کے طالبعلموں یا گول میز کانفرنس کے نمایندوں کی طرح نہایت ادب سے آرام کرسی کے چاروں طرف بیٹھے ہوں گے اور سب کو اسی طرح بیٹھنا پڑے گا مشرقی تہذیب کو جانے دیجئے اگر اُسکی پابندی کیجائے تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ دس پانچ آرام کرسیوں کا اور ایک معمولی کرسی کا انتظام کیا جائے تاکہ مہمان تو آرام کرسیوں پر لیٹیں اور میزبان فدوی بن کر معمولی کرسی پر بیٹھے اور سب مہمانوں کے ساتھ اسطرح پیش آئے گویا ہر ایک کے یہاں فرداً فرداً پانچ روپیہ ماہوار اور کھانے پر ملازم ہے تو آپ ہی بتائیے کہ میزبان ہوا خدمتگار ہو گیا۔ اسی دقت کو دور کرنے کے لئے تہذیب جدید میں میزبان کے لئے آرام کرسی ایجاد ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جب ہم اور آپ اور دوسرے مشرقی تہذیب کے عادی دقیانوسی قسم کے لوگ کسی ایسے مہذب آدمی کے یہاں جاتے ہیں جسکو خدا نے آرام کرسی دی ہے اور وہ ہم کو بدتمیزی آمیز تپاک سے مونڈھے نما کرسیوں پر بٹھا کر خود آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہے تو اُس کی اس بدتمیزی کی بس خون ہی تو کھول جاتا ہے، لیکن ذرا غور تو فرمائیے کہ جب آپکے یہاں لوگ آتے ہیں اور آپ اُن کو بٹھا کر خود دراز ہو جاتے ہیں تو کس قدر خون بڑھتا ہے اور اُن آنیوالوں کا کسقدر خون کھولتا ہوگا۔ اس دنیا میں

تو بس یہی کہ ع

"کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے"

اگر آپکی ناک ایسی ہی بارہ ہاتھ کی ہے تو کیوں جائیے کسی کے یہاں، اپنے ہی گھر پر آرام کرسی لئے پڑے رہئے جسکو غرض ہوگی خود آئے گا اور آپکی دربارداری کریگا۔

آرام کرسی کا نام تو آرام کرسی ہے لیکن اُسپر بیٹھکر یا لیٹ کر آرام سے زیادہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور اِس حساب سے اُس کا نام "کرسی تشخص" ہونا چاہئے اسلئے کہ ہمارے نزدیک اُسکا مقصد سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوتا کہ اُسپر بیٹھنے یا لیٹنے والوں کو امتیازی درجہ حاصل رہے۔ آرام کرسی گویا کرسیِ صدارت یعنی اعزاز کی جگہ ہوتی ہے لیکن اس کو اور بہت سی چیزوں سے معزز تر بنایا جاسکتا ہے۔ مثلاً اُسی کے قریب لگا ہوا حقہ یا سٹک اُسی کے پاس رکھا ہوا اُگالدان اُسی کے ہتھے پر رکھا ہوا خاصدان، اُسی کے آگے رکھی ہوئی چھوٹی سی میز اور اُسی پر پڑے ہوئے مخمل یا کروشیا یا زردوزی کے گدّے وغیرہ۔ اگر ان چیزوں کا بھی انتظام ہو جائے تو کیا کہنا ہے سونے میں سہاگہ والا معاملہ ہو جاتا ہے اور اسی طرح آرام کرسی کو ترقی دے کر تختِ شاہی کے درجہ تک پہونچایا جاسکتا ہے۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ ہمارے ایسے بدتمیز گھر میں آرام کرسی کسطرح رکھی جا سکتی ہے کہ جب کبھی باہر سے آکر دیکھئے یا تو کتے صاحب اُسپر تشریف فرما نظر آتے ہیں یا مُرغی انڈا دیتی ہوئی اور اگر کچھ نہیں لونڈے اُسکی ڈھال پر سے پھسلنے کی مشق کرتے ہوئے ملتے ہیں چنانچہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری آرام کرسی تھوڑے ہی دنوں کے مختلف طریقہ ہائے استعمال سے خدا جانے کیا سے کیا ہو گئی ہے. اُس کے ٹوٹے ہوئے بید نے اُسکو اچھا خاصہ کموڈ بنا دیا ہے اور اب وہ سوائے رفع حاجت کے اور کسی کام کی نہیں رہی ہے۔
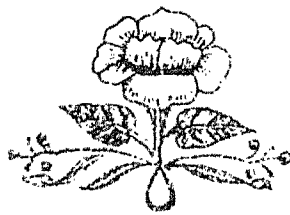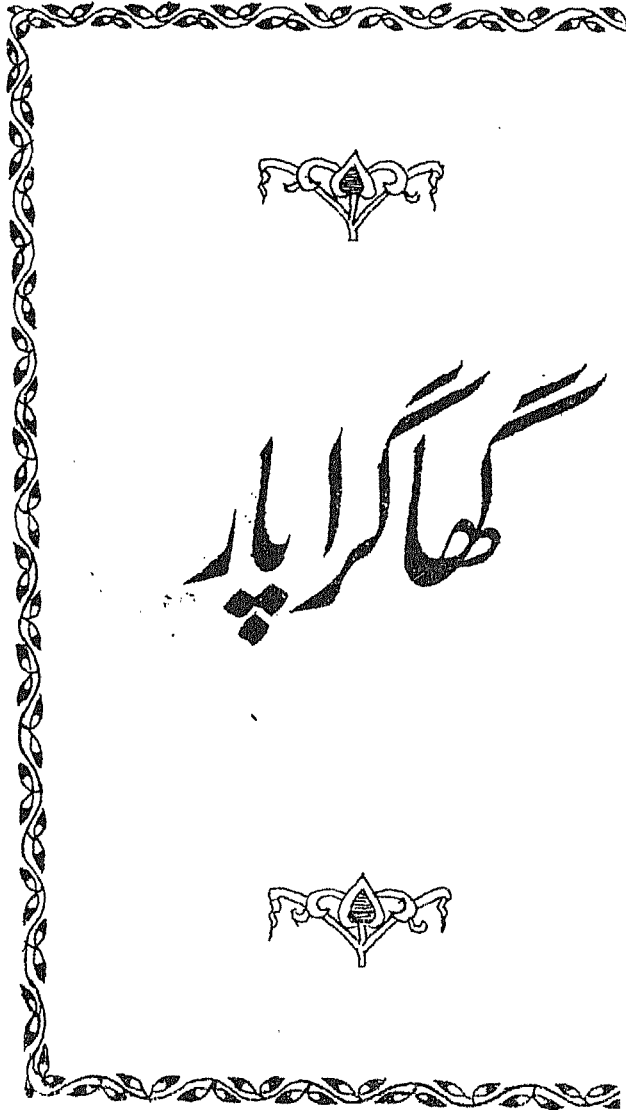
گھاگرا پار

گھاگرا پار

لکھنؤ سے بہت دور گورکھپور میں مشاعرہ ہوا۔ لیکن گورکھپور سے بہت دور
لکھنؤ والوں کی شامت آئی یعنی سکریٹری صاحب مشاعرہ کو خدا جانے کس نے
بتا دیا کہ دفتر سرپنچ لکھنؤ سے شاعر لائے جا سکتے ہیں چنانچہ وہ حضرت اپنی
تمام سادگیوں اور معصومیوں کے ساتھ اسطرح تشریف لائے کہ ہم سے وعدہ
لیکر ہی واپس گئے۔ حالانکہ جن تاریخوں کے لئے ہم نے وعدہ کیا تھا
ان میں تو شاید ہم مرنے کی بھی فرصت نہیں نکال سکتے تھے لیکن مشاعرہ
اور مرنے میں نمایاں فرق ہے چنانچہ مرنیکے لئے فرصت نکلتی یا نہ نکلتی لیکن
مشاعرہ کے لئے فرصت نکلی اور اس طرح نکلی کہ ۲۴ دسمبر کی شب کو سرپنچ کے
باپ بیٹا روح القدس چارباغ کے چھوٹے اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔ اور
گورکھپور جانیوالی گاڑی بدارد تھی اس بدارد سے یہ نہ سمجھئے گا کہ چھوٹ چکی
تھی بلکہ وہ ابھی تک آئی نہ تھی۔

گاڑی کا انتظار تو خیر اتنا تکلیف دہ نہ تھا۔ لیکن چارباغ کے چھوٹے
اسٹیشن پر بغیر سائبان کا پلیٹ فارم اور شبنم کا فیاضی کے ساتھ گرنا ضرور
قابل غور تھا اسپر طرہ یہ کہ وہاں سوائے فرش خاکی کے اور کوئی بیٹھنے کی

جگہ بھی نہ تھی لیکن اسوقت ہم نے اس مصیبت کو محسوس کرنیکے بجائے یہی
مناسب سمجھا کہ پلیٹ فارم پر ٹہلیں اور گنگنائیں۔ یہ اور بات ہے کہ گورکھپور
کے مشاعرہ کی طرح تھی۔ ع

"اللہ بچائے تری تاثیر نظر سے"

اور ہم نے گنگنانا شروع کیا۔ ع

"زمیں سخت ہے آسماں دور ہے"

لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد تمام پلیٹ فارم پر مغلئے اس کثرت کیساتھ
پیدا ہو گئے کہ ہمارا تمام ترنم تو تشریف لیگیا البتہ تھوڑی دیر کے لئے ہمارے
ذہن میں یہ خیال جم گیا کہ ہم پشاور کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہیں۔
اور اسکے بعد ہم نے غور کرنا شروع کیا کہ ایک چھوٹی لائن کی ٹرین میں یہ
بڑی نسل کے انسانوں کی فوج کس طرح سمائے گی اور اگر یہ سما بھی گئی
تو ہم تینوں کا کیا حشر ہوگا ہمارا قلی ہمکو تسلیاں دے رہا تھا۔ لیکن ہم طویل سفر
پہاڑ ایسی رات مغلیوں کی کثرت اور چھوٹی ٹرین کے بھیانک تخیلات میں کھوئے
ہوئے تھے ہمکو یہ یقین تھا کہ مغلئے تیسرے درجے کے علاوہ کسی درجہ میں نہیں
بیٹھتے اور ہمارا انٹر کلاس افغانی طوفان سے محفوظ رہے گا۔ لیکن یہ بھی اندیشہ
تھا کہ وہ ڈھیر سے افغانی اگر انٹر میں گھس آئے تو ہم کیا کریں گے۔ لیکن گاڑی
کے آتے ہی ہم کو یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ تمام مغلئے اپنی شلواریں پھٹکارتے

اور" ترنسے یڑ ٹیخ، بلے دلی دلی" کرتے ہوئے تیسرے درجہ کے مختلف
ڈبوں میں اسطرح گھس گئے کہ ہمارا انٹر صاف بچگیا، اور ہم تینوں انٹر میں
داخل ہوکر دو برتھوں پر قابض ہو گئے۔ ہمارے ساتھ تین آدمیوں کیلئے
صرف دُو بستر تھے اور تیسرا بستر اسلئے نہیں لیا گیا تھا کہ ذرا سبکدوش رہینگے
لیکن اب سوال یہ در پیش تھا کہ چھوٹی لائن کی ان تپلی تپلی برتھوں پر دو عدد
سخا نوں میں تین آدمی کس طرح تمام رات بسر کریں گے لیکن یہ سوال چونکہ ریاضی
سے تعلق رکھتا تھا اور ہمارا شمار ہمیشہ سے ماہرین ریاضی میں ہو اسلئے کہ ہم ہمیشہ
حساب میں فیل ہوئے ہیں۔ لہذا ہم نے اس سوال کو حل کر لیا اور یہ طے پایا کہ
امین صاحب سلونوی تو ایک سحاف میں تنہا آرام فرمائیں اسلئے کہ ان کو کھانسی
آتی تھی اور ہم دونوں میں سے کوئی اسکے لئے تیار نہ تھا کہ ان کے جراثیم کو
سر آنکھوں پر جگہ دے، اور ہم نسیم صاحب کے ساتھ ہمبستر ہو گئے۔ لیکن یہ
ہمبستری اس لئے قابل اعتراض نہ تھی کہ ہم دونوں بالکل اس طرح
لیٹے جس طرح بکس میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ایک کا پنجہ اور ایک کا
پنجہ ایک کی ایڑی، برتھ کے ایک سرے پر ہمارا سر تھا اور دوسرے سرے پر
نسیم صاحب کا سر نمودار تھا دیکھنے والے یہی سمجھ سکتے تھے کہ خدا کی کیا
قدرت ہے کہ دو منھے سانپوں کی طرح دو منھے انسان بھی پیدا کر دیے
لیکن ہم دونوں نہایت آرام سے لیٹے ہوئے تھے البتہ تمام رات اسی کشمکش

میں بسر ہوئی کہ ہم اپنے پیر نسیم صاحب کے منہ پر رکھیں یا کہیں اور اسی طرح ان کو اپنے پیروں کی فکر تھی۔ لیکن ہم دونوں میں نہایت ایمانداری کے ساتھ ایک دوسرے کے واسطے ایثار ہوتا رہا۔ ہم سوئے بھی اور جاگے بھی جاگے تو امین صاحب کی "کھوں کھوں" سے اور جب سوئے تو ان کی کھانسی کے رک جانے سے البتہ نسیم صاحب نے رات کا بیشتر حصہ اپنی مشاعرے والی غزل کی "اور ہالنگ" میں گزارا اسلئے کہ پانچ چھ برس کے بعد غزل کہنے کا اتفاق ہوا تھا یعنی ان کی شعریت پڑے پڑے زنگ آلود ہو چکی تھی لہذا ظاہر ہے کہ اس مشین کو پھر چلانے میں کس قدر دقت ہوئی ہوگی۔ ان کی غزل تو خیر لکھنؤ سے روانگی کے قبل ہی ہو چکی تھی۔ لیکن اب ان کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اسکو پڑھیں گے کس طرح؟ اپنا ترنم بھول چکے تھے اور جب اُسکو یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے تو وہ خدا جانے کس کس رنگ میں یاد آتا تھا مختصر یہ کہ وہ تمام رات فرنگی آرگن کے ساتوں پردے یکے بعد دیگرے آزماتے رہے اور صبح کے وقت جو لے نکلی تھی اسکی تعریف غالب مرحوم پہلے ہی کر گئے تھے۔

نالہ پابندِ نے نہیں ہے فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

غزل کے ساتوں شعر ترنم کے سات گرانقدر نمونے تھے۔ امین صاحب اب بھی کھانس رہے تھے اور ہم کو نیند آرہی تھی۔ لیکن نسیم صاحب نے

لحاف کھینچتے ہوئے کہا" اب اُٹھو گورکھپور قریب ہے" ہم نے لحاف
میں منہ چھپاتے ہوئے کہا" کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تھوڑا سا اور آگے بڑھا دیا
جائے۔ امین صاحب نے کہا۔ "کھوں کھوں کھر" اور نسیم صاحب نے
لحاف گھسیٹ لیا مجبوراً ہمکو انگڑائی لینا پڑی اور انگڑائی لے کر پھر
لیٹنا ہی چاہتے تھے کہ امین صاحب نے کھانستے ہوئے تکیہ بھی چھین لیا
مجبوراً ہمکو اُٹھنا پڑا اور اُٹھکر سب سے پہلے کام یہی کیا کہ بستر باندھ کر
کپڑے وغیرہ پہنے تاکہ گورکھپور کے اسٹیشن پر ہمارا خیر مقدم کرنے والے ہمکو
شریف سمجھیں۔ ہم کپڑے پہن کر بیٹھے ہی تھے کہ گورکھپور کے پلیٹ فارم پر گاڑی رکی
اور ہم گاڑی سے پلیٹ فارم پر آگئے۔ اسباب اُتار لیا، اور چلنا ہی چاہتے
تھے کہ ایک صاحب نے نہایت رازدارانہ طریقہ پر دریافت فرمایا کہ" آپ
حضرات مشاعرہ میں شرکت کے لئے آئے ہیں"؟ ہم نے عرض کیا جی ہاں
آئے تو ضرور ہیں" یہ سنتے ہی وہ ہمارے رہنما بن گئے اور ایک موٹر پر
ہم کو معہ اسباب کے لاد کر ایک عالیشان مکان میں پہونچا دیا۔

یہ مکان صدر مشاعرہ جناب سید شاہ شاہد علی صاحب سبز پوش
فانی رئیس اعظم کا دولتکدہ تھا جہاں صاحب خانہ اپنی تمام تقدس مآبیوں
کے ساتھ ہم سے اس طرح ملے کہ ہم کو خواہ مخواہ عقیدت کیش بن جانا پڑا۔
فانی صاحب یوں تو رئیس اعظم بھی ہیں اور سجادہ نشین بھی سبز پوش بھی۔

اور بزرگ بھی لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر ہیں اور شاعر
بھی ایسے کہ شاعروں کے لئے گویا زندہ سند۔ اس کے علاوہ اُن کے اخلاق
نے ہم کو محو حیرت کر دیا۔ حالانکہ بحیثیت میزبان ان کو یہی اخلاق برتنا چاہئے تھا
لیکن سچ یہ ہے کہ آجکل کے میزبان مہمانوں کے ساتھ اخلاق تو درکنار وہ سلوک
کرتے ہیں جو کسی دفتر کا آفس سپرنٹنڈنٹ کلرکوں کے ساتھ کرتا ہوگا لیکن
فانی صاحب کا تو یہ حال تھا کہ حالانکہ ہم تینوں ان کے بڑے منجھلے چھوٹے
صاحبزادے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہ تھے کہ ہم لوگوں کے سینے
بچھے جا رہے تھے۔ ہم نے ان کو اور ان کی تمام تواضع کو اپنے اپنے حال پر
چھوڑ کر منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ اور چائے شروع کر دی لیکن
چونکہ دس ہی بجے سے مشاعرہ تھا اور اب بج چکے تھے تقریباً نو۔ لہذا مناسب
یہی معلوم ہوا کہ لگے ہاتھ حضور بھی تناول فرما کر اپنے المکلف الخدمت کو ممنون
بھی فرما دیں چنانچہ یہ بھی ہوا اور پھر ہم سب مشاعرہ جانے کی تیاریوں میں
مصروف ہو گئے۔ عین اُسیوقت محبی شمیم احمد صاحب نظرت واسطی بھی تشریف
لے آئے جنکو اسٹیشن پر آنکھیں ڈھونڈھ کر نا کام رہ چکی تھیں یہ حضرت چاہے
انسان ہوں یا نہ ہوں لیکن خلوص کے پتلے ضرور ہیں۔ خیر صاحب ان سے
بھی تھوڑی دیر تک خلوص گھبار آگیا اور پھر اس خلوص کو مشاعرہ تک باقی
آئندہ کرنے کے بعد ہم تو صدر مشاعرہ یعنی اپنے میزبان کے ساتھ موٹر پر

سینٹ اینڈریوز کالج کی طرف روانہ ہوگئے جہاں مشاعرہ تھا وہ بیچارے
اپنے گھر چلے گئے ہوں گے۔

مشاعرہ گاہ یعنی کالج کے ہال میں پہنچکر معلوم ہوا کہ گورکھپور کا یہ
عام قاعدہ ہے کہ جب مشاعرہ کا وقت دس بجے دیا جائے تو اسکے معنی یہ
سمجھے جاتے ہیں کہ مشاعرہ ۱۲ بجے شروع ہوگا۔ ہم نے اپنے دل میں کہا کہ سخت
حماقت کی جو ہم ابھی سے چلے آئے اور پھر بانیان مشاعرہ پر غصہ آیا کہ جب ان کو
دس ہی بجے شروع کرنا تھا تو آخر صبح کا وقت کیوں نہیں دیا تھا لیکن ہم کو
زیادہ پیچ وتاب کھانا نہیں پڑا اسلئے کہ محمد انعام الحق صاحب عزیز سکریٹری
مشاعرہ یعنی وہی حضرت جو ہمارا وارنٹ گرفتاری لیکر دفتر سرتیج گئے تھے
تشریف لے آئے اور ہمارا شکریہ وغیرہ ادا کرنے لگے کچھ دیر تک ان سے باتیں
ہوتی رہیں۔ کچھ دیر ہم سے اور صدر مشاعرہ سے گفتگو ہوئی کچھ دیر ان صاحب
کی گفتگو اور ان کی کھانسی سنتے رہے کچھ دیر نسیم صاحب کے غزل پڑھنے
کی مشق کا لطف اٹھاتے رہے یہاں تک کہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب مشاعرہ
شروع کر دیا گیا اور کالج کے طلبا نے غزلیں پڑھنا شروع کر دیں۔ قصہ دراصل
یہ ہوا تھا کہ مشاعرہ کے دعوت نامہ میں دو طرحوں کا اعلان اس طرح کیا گیا تھا:

(۱) "اللہ بچائے تری تاثیر نظر سے"

(۲) "رہ فنا میں کوئی راہبر نہ تھی"

اور دونوں طرحوں کے بعد یہ نوٹ لکھے کہ:۔

(۲) دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کوئی لازمی بات یا شرط نہیں ہے

(۲) گیارہ اشعار سے زیادہ پڑھنے کی زحمت نہیں دی جائے گی۔

تو ہوا یہ کہ کالج کے طلبا نے اسکے یہ معنی نکالے کہ دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کرنا کوئی لازمی بات یا شرط مشاعرہ تو نہیں ہے لیکن اگر کوئی دوگنی محنت کرے تو ظاہر ہے کہ بانیانِ مشاعرہ ممنون ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اسکے بعد یہ طے کیا کہ ہر غزل میں گیارہ اشعار سے زیادہ نہ پڑھنا چاہئیں۔ لہٰذا دونوں غزلوں کے اشعار ملا کر بائیس ہو گئے۔ حالانکہ اگر کوئی بی۔ اے ایل ایل بی قسم کا قانون داں شخص اس مشاعرہ کا سکریٹری یا صدر ہوتا تو یہ قانونی نکتہ نکال سکتا تھا کہ بفرض محال دونوں غزلوں کا پڑھنا جائز بھی قرار دیا جائے تو بھی یہ شرط کہ گیارہ اشعار سے زیادہ پڑھنے کی زحمت نہ دی جائیگی قائم رہتی ہے اور دونوں غزلوں کو ملا کر یا صرف ایک غزل میں ہر شخص گیارہ شعر تو پڑھ سکتا ہے لیکن بارھواں نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن وہاں یہ قانونی اعتراض نہیں کیا گیا۔ اور اس کا خمیازہ تمام حاضرینِ مشاعرہ کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ کوئی شخص بغیر بائیس شعر پڑھے ہوئے اسٹیج سے اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا سنتے سنتے سنتے سنتے ناک میں دم آ گیا مگر کیا کرتے ہم شاعر تھے اور آدابِ مشاعرہ کا لحاظ ضروری تھا ورنہ یہ نفس کشی ہمارے بس کا روگ نہ تھی۔ خدا خدا کر کے دو بجے

سے قریب طلبا رختم ہوئے اور مقامی شعرا نے پڑھنا شروع کیا ہم سمجھتے تھے
کہ یہ حضرات فی کس گیارہ شعر پڑھکر جان بخشدیں گے مگر ہمارا خیال غلط ثابت
ہوا. یہ حضرات بھی اس دو طرحی مشاعرہ میں دوگونہ عذاب بنکر آئے تھے
اور انھوں نے بھی وہی فی شاعر بائیس شعر کے نرخ مشاعرہ کو برقرار رکھا بس
یہ سمجھیے کہ ہم کو تاؤ پر تاؤ آرہا تھا مگر کیا کرتے مجبور تھے ہم کو تو اس وقت
مولانا محمد علی کا یہ مصرعہ یاد آرہا تھا . ع

مارا دیار غیر میں مجھکو وطن سے دور

وہ تو کہیے کہ عین اُسی وقت برادرم منشی سکھ دیو پرشاد بسمل، محترمی حضرت
اصغر گونڈوی. حضرت آدمی مچھلی شہری اور ہمارے دیرینہ دوست جناب مجنوں گورکھپوری
مشاعرہ میں آپہونچے، اور ہماری جان میں جان آئی اسکے بعد سے مشاعرہ کم سے کم
ہمارے لئے ذرا پرلطف ہوگیا اسلئے کہ ہم ایک شعر سنتے تھے تو دس باتیں ان
حضرات سے کرلیتے تھے. ہم تو ہم امین صاحب سلونوی کو بھی اب ذرا دور کی
سوجھی اور لگے اپنے مخصوص انداز میں شعرا کو داد دینے، لیکن نسیم غریب اپنی
غزل کی دُھن میں تھے اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی طالب علم امتحان
کے کمرہ میں جانے کے لئے تیار ہورہا ہو کبھی ہم سے کہتے تھے کہ "ارے یار
ہم سے نہ پڑھواؤ" لیکن جب ہم کہتے تھے کہ "احمق ہوئے ہو" تو وہ پھر
تیاری میں مصروف ہوجاتے تھے. بہرحال اب مشاعرہ اچھی طرح کٹ رہا تھا

شمیم صاحب حیرت اور اُن کے والد محترم حکیم عارف صاحب مدیر شاہکار ہم رہے
مشاعرہ کا بار ہلکا کرنے کے لئے آ گئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ استاد الشعراء
منقار الدولہ جند الہند حضرت ناچیز گورکھپوری بھی تشریف لے آئے تھے. کبھی
ان سے کچھ بات کر لی کبھی مجنوں کو چھیڑ دیا یہاں تک کہ مغرب سے ذرا قبل بیرونی
شعراء کی نوبت آئی اور ہم نے نسیم صاحب کی طرف دیکھا اُسوقت وہ غریب نہایت
تیزی کے ساتھ غزل کی لے رٹ رہا تھا اور چہرے پر تو ایسی ہوائیاں اُڑ رہی
تھیں گویا اب انکو پھانسی کا حکم سنایا جائے گا. ہمکو اپنی طرف مخاطب دیکھکر
اسنے نہایت بےکسی کے انداز میں کہا "ہماری غزل کسی اور سے پڑھواؤ" اسوقت
ہم نے بھی یہی مناسب سمجھا اور برادرم فطرت سے کہا کہ بھائی تم شمیم ہو لہذا نسیم کی
غزل پڑھ دو وہ تیار ہو گئے اور نسیم صاحب کا یہ حال ہوا گویا نئے سرے سے
زندگی پائی ہو. ان کی غزل پڑھی گئی اور خوب خوب سنی گئی ان کے بعد امین صاحب
سلونوی نے غزل فرمائی اور مشاعرہ کا رنگ بدل دیا آپکے بعد یہ خاکسار اسٹیج پر
غزل پڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا. معلوم نہیں ہماری غزل کا کیا حال رہا اس لئے کہ
غالباً غزل پڑھنے والے کو اپنی غزل کے رنگ جمنے یا نہ جمنے کی خبر نہیں ہوتی
بہرحال ہم نے اپنی غزل پڑھی اور سلام کرتے ہوئے پلیٹ فارم سے اُتر آئے.
یہی خیریت ہوئی کہ بنائے نہیں گئے. ہمارے بعد جناب بسمل نے مشاعرہ کو بسمل کیا.
پھر حضرت ہادی مچھلی شہری نے مشاعرہ کو ماہی بے آب بنایا اور اس کے بعد

نشاط روح کے روح رواں بلکہ ہندوستانی اکاڈمی کے ماہی سالہ ہندستانی
کے ایڈیٹر جناب اصغر گونڈوی کی باری آئی۔ اصغر صاحب میں یہ خاص بات ہو کہ
ان کو شعر کہنا تو ایسے آتے ہیں کہ سبحان اللہ لیکن پڑھنا بالکل نہیں آتا وہ مخصوص
احباب کے مجمع میں تو خیر کسی نہ کسی طرح ترنم کے ساتھ بھی شعر پڑھ دیتے ہیں لیکن مشاعرہ
میں تو بس یہ معلوم ہوتا ہو کہ نسیم صاحب ہی کے کوئی ضخیم ایڈیشن ہیں ہم انکی
گھبراہٹ بلکہ پس و پیش کو پہلے ہی سے محسوس کر رہے تھے لیکن جب وہ مردانہ وار
پلیٹ فارم پر پہونچ گئے تو ہم نے کہا واہ مرے شیر، لیکن جب انھوں نے
پڑھنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ وہ اگر کوشش بھی کریں تو شعر سنانا اُن کے اختیار
میں نہیں ہو۔ مجمع نے "بلند آواز سے بلند آواز سے" کے نعرے لگائے اور اصغر صاحب نے
پہلو بدلنا شروع کر دیے۔ ان کی یہ حالت ہم سے دیکھی نہ گئی اور پلیٹ فارم پر
پہونچکر ان کی غزل اُن کی طرف سے پڑھنا شروع کر دی، اب مجمع مطمئن تھا،
اور اصغر صاحب بھی مطمئن اُسوقت اُن کے دل سے ہمارے لئے جو دعائیں نکل رہی
ہوں گی ان کو کچھ ہم ہی خوب جانتے ہیں یا خود اصغر صاحب جانتے ہوں گے۔
اصغر صاحب کی دو غزلیں پڑھنے کے بعد ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے
حلق میں ببول کا کوئی پودا نشو و نما پا رہا ہو۔ بہرحال ہم خود اپنے ہاتھ سے
اپنا گلا تھامے ہوئے دوسری مرتبہ پلیٹ فارم سے اُترے اور صدر مشاعرہ
کی وجد آفریں غزل سننے لگے۔ فانی کے کلام کی داد دینا ہم اپنے نزدیک ذرا

گستاخی سمجھتے ہیں اسلئے کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی اس غزل کے بعد مشاعرہ ختم ہو گیا۔ لیکن حضرت ناچیز اپنی حماقت آبی کا ثبوت دیتے رہے اور ہم سب ان کو پڑھتا ہوا چھوڑ کر باہر آ گئے۔

مشاعرہ سے باہر آ کر مجنوں صاحب گورکھپوری کے والد بزرگوار یعنی جناب دیوانہ گورکھپوری جنکو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے مگر سمجھے خاک نہ تھے اور نہ اسکی کوشش کی تھی، موجود تھے اور ہم سب کو یعنی گورکھپور کے سودیشی شعراء کے علاوہ بدیشی شعراء جتنے تھے سب کو کہیں لیجانا چاہتے تھے ہم تو گویا مردہ بدست زندہ تھے ایک موٹر پر لاش کی طرح لاد کر ایک نہایت عالی شان کوٹھی میں پہنچا دیے گئے جس کا نام دیکھکر ہم سمجھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار کا دفتر یہی ہے اسلئے کہ جلی حروف میں "الہلال" لکھا ہوا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دراصل گورکھپور کے شرافت مجسم، نجابت مجسم، سخاوت مجسم صباحت مجسم، ملاحت مجسم، فصاحت مجسم اور بلاغت مجسم رئیس اعظم شاہ جواد علی میاں کی کوٹھی ہے۔ اس کوٹھی کے سبزہ زار پر ہم سب چرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے۔ یہ گویا ایٹ ہوم سے ذرا چھوٹی ٹی پارٹی سے ذرا بڑی قسم کی دعوت تھی اور یہاں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس ذرۂ بمقدار کے مزاحیہ مضامین کے دوسرے مجموعہ "سحر تبسم" میں چار دوالا مضمون پڑھ چکے تھے اور میرے عشق لیٹن سے واقف تھے لہذا مجکو بھر بھر کے چار کی پیالیاں ملنے لگیں نسیم صاحب

میٹھے قسم کے بسکٹوں اور پیسٹریوں پر ٹوٹ پڑے۔ آئین صاحب نے وہ چیزیں انتخاب کرلیں جو کھانسی کیلئے یا تو مفید تھیں یا کم سے کم مضر نہ تھیں اور باقی حضرات مختلف چیزوں پر ہاتھ مار رہے تھے چائے کا دور ختم ہونے کے بعد پھر شاعری شروع ہو گئی تاکہ شاہ عباد علی میاں جو اپنی خاندانی روایات کے مطابق مشاعرہ کی شرکت نہ کرسکتے تھے ہم لوگوں سے بحیثیت شاعر کے بھی مل لیں۔

یہ سلسلہ رات کے نو بجے تک جاری رہا۔ اور اور ہم میں سے اگر سب نہیں تو کم سے کم میں ضرور ان کی خوش مذاقی اور پاکیزگیٔ ذوق سے مسرور ہوتا رہا، لیکن ڈر معلوم ہو رہا تھا۔ دیوانہ صاحب سے اسلئے کہ اول تو وہ مجنوں صاحب کے والد محترم تھے دوسرے ان کی برجستہ تنقیدیں برمحل چٹکیاں اور فنی معلومات کا بیدھڑک استعمال ہماری تمام قابلیت کے نشہ کو ہرن کر چکا تھا اور ہم یہی دعا مانگ رہے تھے کہ خدا عزت رکھ لے۔ لیکن وہ تھوڑی ہی دیر میں جہاں تبحر کی بہترین مثال ثابت ہوئے وہاں دلچسپی اور دلبستگی کا بھی بہترین نمونہ ہو گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ ان میں ایک نامعلوم کشش ہے جو ہم کو ان کی طرف کھینچ رہی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی تک تو وہ اس مجمع کے لئے ایک بارگراں تھے لیکن اب شمع محفل نظر آنے لگے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس قسم کے "المختصر" انسان میں اتنی بہت سی

باتیں کس طرح سماگئی ہیں. لیکن آج ہم کو اس بات کا یقین بھی ہوگیا کہ واقعی بہت سے انسان جتنے زمین کے اوپر نظر آتے ہیں اس کے دوچند بلکہ سہ چند زمین کے نیچے بھی ہوتے ہیں۔

اس مجمع میں جواد علی شاہ میاں تو اپنا خاموش جادو ہم سب پر چلا رہے تھے اور ہم سب اس مجمع کے سامنے دن بھر کے تھکے ہوئے کندھا ڈالے بیٹھے تھے بڑی مشکل سے نو بجے کے قریب جلسہ ختم ہوا اور ہم سب اپنی اپنی قیام گاہ کو رخصت ہوئے لیکن اس سے قبل کہ ہم روانہ ہوں کے نسیم صاحب کی گورکھپور میں بھی سرپنچ کے خیال نے چٹکی لی اور انھوں نے شاہ جواد علی میاں سے سرپنچ کے لئے گشت کرنے کو صبح موٹر مانگ لی. اس لئے کہ دوسرے دن سرپنچ کی اشاعت کے لئے ٹھیرنے کا ارادہ تھا قصہ مختصر یہ کہ الہلال سے روانہ ہوکر ہم کو از روئے قاعدہ اپنے میزبان خصوصی جناب فانی سبز پوش کے دولتکدہ پر آنا چاہئے تھا. لیکن ہم راستہ بھول کر خدا جانے کہاں پہونچے. لیکن قیاس یہ ہے کہ چونکہ مجنوں صاحب ہمارے رہنما تھے لہذا وہ ہم کو نجد ہی میں لیگئے ہوں گے. بہر حال یہ عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ نجد بھی لیلیٰ سے خالی نہ تھا یہ اور بات ہو کہ اس لیلیٰ سے ہمکو دلچسپی نہ ہوئی ہو لیکن یہ بھی غور کیجئے کہ جیسا مجنوں ویسا ہی نجد اور ویسی ہی لیلیٰ۔ دوسری بات یہ ہے کہ خستگی نے اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ مجنوں اور لیلیٰ یا ان دونوں اور نجد میں

کوئی امتیاز نہ کرسکیں. لہذا سیدھے اپنے قیام گاہ پر آئے اپنے میزبان کو کھانے کی میز پر منتظر پایا، کچھ کھایا کچھ پیا اور خوابگاہ میں جاکر اس طرح سوئے کہ امین صاحب کی ہمبستر تو حسب معمول ان کی کھانسی تھی اور ہم زنانہ رسالہ حریم کے پروپرائٹر نسیم صاحب کے ساتھ ہمبستر تھے لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی اور گھوڑے بیچ کر ایسے سوئے کہ صبح سات بجے کے قریب آنکھ کھلی یعنی اُسوقت جبکہ ہم کو ایک صاحب کے یہاں جا کر پہونچ جانا چاہئے تھا موٹر ہمارے انتظار میں تھا لہذا ہم نے جلدی جلدی داڑھی صاف کی ہاتھ منھ دھو کر چلدیے اور پہونچے مجنوں صاحب کی سُسرال جہاں سے ان کو ساتھ لینا تھا ان کو ساتھ لیکر جن صاحب کے یہاں جا کر مدعو تھے ان کے یہاں پہونچے۔ اگر وہ صاحب ہم کو معاف فرمادیں تو ہم ان کا اسم مبارک بھول گئے لیکن خیال یہ ہے کہ یا تو عنایت صاحب ان کا نام تھا ورنہ نعمت صاحب ضرور تھا اور یہ بھول چوک محض اس لئے ہوتی ہو کہ انھوں نے سرپنچ کی خریداری منظور کرنے کے بعد بھی نقد چندہ نہیں دیا ورنہ ان کا نام درج رجسٹر ہوجاتا اور آج شبہ پیدا نہو سکتا. خیر مطلب تو اس سے ہے کہ ان کے یہاں چا پی اور ناشتہ کھایا اسکے بعد ہم لوگ بالکل ہینگ بیچنے والے آغا تھے یعنی جس طرح وہ " اینگ لیو اینگ" کی صدائیں لگاتے ہوئے گشت کرتے ہیں اسی طرح

"ہم سر پنچ لیڈر سر پنچ" کہتے پھر رہے تھے۔ ہمارا یہ گشت کامیاب بھی رہا اور دلچسپ بھی، کامیاب اس لئے کہ خریدار کم وقت میں بہت سے مل گئے۔ اور دلچسپ اس لئے کہ بھانت بھانت کے انسانوں سے سابقہ پڑا۔ مجنوں صاحب نے ایک صاحب کی بڑی تعریف فرمائی اور ان کا پتہ بتا کر کہہ دیا کہ وہ ضرور خریدار ہوں گے۔ لہذا ہم نے موٹر کا رُخ اسی طرف کر دیا اور مجنوں سے رخصت ہو کر ایک آدھ صاحب کو خریدار بناتے ہوئے ان کے یہاں پہونچے اس وقت ہمارے ساتھ سکریٹری صاحب مشاعرہ بھی تھے ہم تینوں بلکہ سکریٹری صاحب کو ملا کر چاروں صاحب نے بہت جھک جھک کر سلام کیا۔ لیکن بجائے جواب دینے کے اُنھوں نے ہونق نما صورت بنائی پھر فرمایا "کیا ہے؟"

ہم نے عرض کیا۔ "آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "ایں ایں"

ہم نے ذرا بلند آواز سے کہا "آپ ہی کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔"

انھوں نے مار بیٹھنے کے انداز میں سر پر دونوں ہاتھ رکھکر نہایت ڈراونی آواز میں کہا "ایں۔ ایں۔ آئیں۔ آئیں۔"

ہم نے اور بھی زور سے کہا۔

"آپ ہی کے پاس آئے ہیں۔"

اسکے بعد انھوں نے اتنی زور سے "ایں" کہا جس کو اگر لکھا جا سکتا ہے تو اُسی قلم سے لکھا جا سکتا ہو جس سے "سرپنچ" کا سرنامہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی اس وحشت سے ہم کو یقین ہو گیا کہ یہ بہرے بھی ہیں اور پاگل بھی ماریں گے بھی اور کاٹ بھی کھائیں گے لہذا ہم تو چپ ہو گئے۔ لیکن سکریٹری صاحب مشاعرہ نے کہا۔

"یہ حضرات لکھنؤ سے مشاعرہ میں آئے تھے۔"

انھوں نے پھر بڑی زور سے دھاڑ مار کر کہا۔

"تو پھر اب کیا ہو مشاعرہ تو ختم ہو گیا، ختم ہو گیا، اب کیا ہو؟"

ہم نے دل میں کہا۔ بھاگو یہاں سے لیکن آہن بھلا کب چھوڑ سکنے والے تھے انھوں نے ان حضرت کو راہ پہ لانے کی کوششیں شروع کر دیں اور بڑی دیر تک سر کھپانے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہم سب نے یہاں آکر خون بھی خشک کرایا اور وقت بھی ضائع ہوا۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ پٹے نہیں اور صحیح سلامت واپس آ گئے۔

وہاں سے واپسی پر ہم کو پھر شاہ جواد علی میاں کے یہاں ڈنر پر پہونچنا تھا چنانچہ پھر الہلال پہونچ گئے۔ جہاں علاوہ شعراء کے مخصوص معززین بھی تشریف رکھتے تھے ڈنر سے قبل تو خوش گپیاں ہوتی رہیں لیکن اسکے بعد ہی کھانے کی میز پر غذائے روح بھی چن دی گئی حالانکہ

پر تکلف ڈنر کے بعد کسی کے پیٹ میں اس غذائے روح کی بھی جگہ نہ تھی لیکن شعر بازی ہوتی رہی اب ہم کو پھر سرتیج کے لئے گشت کرنا تھا لیکن دیوانہ صاحب نے ہم کو جانے نہ دیا اور یہ طے پایا کہ ہم آج سہ پہر کو شاہ جواد علی میاں کے فارم کی سیر کریں یہ پر خلوص دعوت کیسے رد کی جاتی لیکن سوال یہ تھا کہ ہم کو آج ہی واپس ہونا بھی تھا اور اپنے میزبان فائق صاحب سے بھی رخصت ہونا تھا اسلئے کہ وہ بہار شریف تشریف لے جا رہے تھے لہذا یہ طے پایا کہ ہم اُن سے ابھی سے رُخصت ہولیں اور اپنا سامان حکیم عارف صاحب کے یہاں پہونچا دیں جہاں سے دعوت میں شرکت کے بعد ہم کو گورکھپور سے رخصت ہونا تھا۔ لہذا اُسی پروگرام پر عمل کرنے کے بعد ہم شاہ جواد علی میاں کے فارم پر پہونچے اور اسی مقام پر سہ پہر کی چار بھی پی وہاں سے واپسی پر راستہ میں دیوانہ صاحب سے گفتگو کا کافی موقع ملا۔ اور اسوقت ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی روحانی طاقت ہم میں خود بخود دسمار ہی ہے۔ اس گفتگو کے متعلق ہم دیوانہ صاحب کو مخاطب کر کے صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب — یہاں غالب کے بجائے دیوانہ سمجھے
تجھے ہم ولی سمجھتے جو اسقدر کھو یا ہو اسا اور منتشر سا انسان نہ ہوتا

لیکن ہمکو پھر بھی بہت سی ایسی چیزیں اس گفتگو سے حاصل ہوئیں جو
ابتک حاصل نہوئی تھیں۔

واپسی پر پھر ہم الہلال آئے شاہ جواد علی میاں صاحب سے رخصت
ہوئے اور دفتر شاہکار پہونچے تاکہ اپنے پر خلوص دوست نظرت واسطی
اور بزرگ محترم حکیم عارف صاحب کے یہاں پرخلوص کھائیں دعوت اسلیے
نہ کہیں گے کہ یہ دعوت نہیں بلکہ دراصل خلوص ہی تھا مچھلی کھائی۔ پلاؤ کھایا
فیرینی کھائی، کباب کھائے اور پڈنگ کے تیار نہونے کا افسوس دل میں
لئے ہوئے اسٹیشن پر پہونچے جہاں سکریٹری صاحب مشاعرہ معہ اپنے کالج
کے ایک پروفیسر صاحب اور ایک طالب علم صاحب کے موجود تھے ان
حضرات نے ہم کو کانٹوں میں گھسیٹنا شروع کردیا یعنی ہمارا سامان موٹر سے
خود اُتارا اور ریل میں خود رکھا خصوصاً سکریٹری صاحب مشاعرہ نے
تو یہ ثابت کردیا کہ گویا ایک سکریٹری مشاعرہ کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ
باہر سے آنیوالے شعراء کا بستر بھی خود لگائے ہم ان کی نوازشوں سے
عرق عرق ہو ہی رہے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں دیوانہ صاحب یہاں بھی موجود
اور پھر کیا دیکھتے ہیں کہ بزرگ محترم فانی صاحب بھی موجود یا اللہ یہ کیا قصہ
ہے۔ کیا یہ حضرات گورکھپور سے مارے خلوص کے ہم کو لکھنؤ تک پہونچا کر
چھوڑیں گے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں گاڑی نے سیٹی دی اور ہم سے

نہایت گرمجوشی کے ساتھ آپس میں ملے ۔ دیوانہ صاحب سے ملنے کے وقت میرے قلب کی حرکت بڑھ گئی تھی اور سکریٹری صاحب مشاعرہ سے ملنے کے وقت میری آنکھوں میں محبت اور مسرت کے آنسو تھے اور مجھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ حضرات گورکھپور نے مجھکو اپنے خلوص سے اپنالیا ہے میں اس خلوص کو شاید کبھی نہ بھولوں یہ مزاح نگاری نہیں کر رہا ہوں بلکہ واقعہ نگاری ہے۔ گاڑی چلی اور ہم گورکھپور والوں کی شوکت نوازی امین نوازی، نسیم نوازی، اور سب سے بڑھکر سرنج نوازی کے خیالات میں مستغرق ہو کر اسوقت ہشیار ہوئے جب لکھنؤ کے اسٹیشن پر نسیم صاحب قلی کو پکار رہے تھے اور امین صاحب کھانس رہے تھے۔
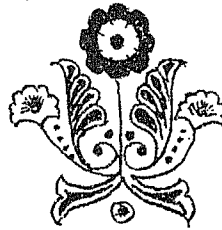
بیوی کا پروپگنڈا

بیوی کا پروپگنڈا

"ارے بھئی وہ تمھاری بھاوج آج صبح سے تم سب کا انتظار کر رہی ہیں انھوں نے آم وغیرہ خرید کر رکھے ہیں۔"

اس کے ان الفاظ پر ہم میں سے ہر ایک نقش حیرت بن کر رہ گیا۔ بات یہ تھی کہ وہ خود تو حلقۂ احباب میں اپنے نام کے برعکس ابلیس کے نام سے مشہور تھا اور ہم سب جانتے تھے کہ ہمارے شیطانی لشکر کو بھی اگر کہیں شکست فاش ہوئی ہو تو وہ ان ہی حضرت کی کنجوسی کے مقابلہ میں ان کو بیوقوف بنا کر کھانا تو خیر ہمارے فرشتوں کے بس میں بھی نہ تھا لیکن انھوں نے کبھی ہم کو مسکین سمجھ کر بھی یہ ثواب حاصل کرنے کی کوشش نہ کی اور ہمیشہ اپنا یہی اصول رکھا کہ ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   گر زر طلبی سخن درین است

یہاں تک کہ ہم سب تھک کر مایوس ہو چکے تھے کہ ان تلوں سے تیل نہیں نکل سکتا اور یہ شخص "چمڑی جائے دمڑی نہ جائے" کی زندہ تصویر ہی بنی رہے گا۔ جب تھی کہ آج خلاف معمول اُن کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر ہم سب کو سخت حیرت تھی بلکہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ الفاظ واقعی ابلیس نے کہے ہیں اور ان میں کوئی اصلیت بھی ہے۔ یہاں تک کہ خود میں نے اس طلسم حیرت کو توڑ کر کہا

پوچھا۔ "کیا کہا تم نے آموں وغیرہ کا انتظام کیا ہے؟"
لاپروائی سے جواب دیا" ارے بھائی ہاں صبح سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے
بار بار پوچھ چکی ہیں کہ تمہارے دوست آتے کیوں نہیں ہیں، میں نے کہدیا کہ
شاید آج آئیں تو بیچاری آموں میں برف ڈالے بیٹھی رہیں مگر تم لوگ بھلا
ہمارے یہاں کیوں آنے لگے"۔
ہم نے کہا۔" یہ بات ہے تو ہم ابھی چلتے ہیں مگر کیا واقعی تمہاری بیوی نے
ہم لوگوں کے لئے آج آموں کا انتظام کیا ہے؟"
اپنے مخصوص انداز میں بولے۔" اب میں آخر کس طرح کہوں، مگر اب کیا کروگے
جاکر انتظار کرتے کرتے انھوں نے آم تقسیم بھی کر دیے مگر خیر چلو شاید کچھ ہوں"
ہم سب نے کہا" خدا کرے کہ ابھی باقی ہوں" اور فوراً ان کے ہمراہ یتیم خانہ
کے بچوں کی طرح ہو لئے، ان کے گھر پر پہونچکر زیادہ انتظار بھی نہ کرنا پڑا وہ فوراً
ہی ایک طشت میں کچھ تخمی آم لئے ہوئے برآمد ہوئے اور ایک عجیب ٹھاٹھ
سے فرمایا" لو کھاؤ" لاش پر چھٹنے والے گدوں کی طرح ہم آموں پر جھپٹ پڑے
حالانکہ آم بہت تھوڑے تھے اور کچھ مزے میں بھی بہت زیادہ اچھے نہ تھے
لیکن ہم سب تو یہ سمجھ کر آم کھا رہے تھے کہ" بڑے موذی کو مارا" اور تعریف
کرتے جاتے تھے خیر ہم تعریف کرتے یا نہ کرتے ہمارے میزبان صاحب
خود ہی تعریفوں کے پل باندھے ہوئے تھے۔" دیکھیے یہ آم چھوٹے ضرور ہیں

اور ان کا ریشہ بھی بہت بڑا ہے لیکن عجیب پُرکیف آم ہیں۔ تم ان کی گٹھلی تک
نہ جاؤ اور نہ رس کی کمی پر غور کرو بلکہ یہ دیکھو کہ لطیف آم ہیں۔ مگر یار بڑے
گراں ہیں۔ وہ تو کہو کہ یہ آم والا ہمارے یہاں بہت رعایت سے آم دیجاتا ہے
اور تمھاری بھاوج روز اسی قسم کے آم کھاتی ہیں اسلئے اس نے بمشکل تمام
چھ آنہ سیکڑہ یہ آم دیے ہیں ورنہ منڈی میں ایک روپیہ سے نہیں مل سکتے!
بھائی اسی لئے میں نے دسہری اور سفیدہ وغیرہ سب کو چھوڑ کر ان ہی کو پسند
کیا ہو واللہ سب آموں کا انہیں مزا ہے گویا شہد کے سربمہر گلاس ہیں اور اتنے
سے آم میں گٹھلی تو دیکھو ماشاءاللہ کتنی بڑی ہو۔"

مجھ سے نہ رہا گیا اور آخر میں نے مجبوراً کہا "او منحوس اور انسانیت کے
دشمن یہ آم انسانوں کے کھانے کے ہیں نہ کمبختوں میں رس ہو نہ کوئی مزا معلوم
ہوتا ہو کہ تیزاب کا پھل بیٹھے چوس رہے ہیں اور ریشے تو ایسے ہیں کہ گویا تو ہم کو
آم نہیں کھلا رہا ہو کہاروں کی طرح رسّی بٹوا رہا ہو۔ ارے کمبخت آج تو نے خدا
خدا کر کے کفر توڑا تھا تو ذرا ڈھنگ کے آم لایا ہوتا لاحول ولا قوۃ۔"

ناک بھوں چڑھا کر بولے:۔ "خیر چھوڑو اس قصہ کو تم کو تو بس ہر چیز میں عیب
نکالنا آتے ہیں مجھ سے کیا کہہ رہے ہو اُن بیگم صاحبہ سے کہو جنھوں نے تم ایسوں کو
بلا کر آم کھلائے ہیں۔"

ہم سب نے مصلحت یہی دیکھی کہ اسوقت چپ ہورہیں بلکہ سب نے بہت بہت

تعریف کی اور ان کی بیوی کی تو اتنی تعریف کی کہ ہمارے پاس الفاظ نہ تھے اور ان کو مزید تعریفیں کرنے کا موقع مل گیا کہنے لگے۔

"کچھ عجیب اُن کی عادت ہے کوئی اچھی چیز ہو بس ان کا سب سے پہلے یہی دل چاہے گا کہ تم لوگ آجاؤ اور تم کو کسی طرح یہ چیز مل جائے آج صبح کچھ کیک خود ہی بنائے تھے اور لطف یہ کہ آپ کھاتی جاتی تھیں اور انگریزی بولتی جاتی تھیں لیکن میری شامت آئی میں نے کہہ دیا کہ ع

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار

بس جناب انھوں نے برجستہ کیتلی کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ع

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

میں تو جناب دنگ رہ گیا کہ غالب کا کلام اور ان کو اس طرح یاد ہے اور آج ہی پر کیا مختصر ہے ابھی تین چار دن ہوئے نہیں معلوم کس بات پر میں نے کہا کہ ع   خیال کیجئے کیا آج کام میں نے کیا

بس فوراً ہی آپ پان بناتے بناتے بولیں۔ ع

جب اُسنے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

اور پھر میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ آپ نے "دُشٹ آپ" کہکر میرا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا اور کہنے لگیں کہ غالب نے بھی یہی کہا ہے اور انشاء اللہ خاں نے بھی اچھا کہا ہے۔

واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب   یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اسکے علاوہ فارسی شعرا کا کلام تو ان کو اتنا یاد ہے کہ میری نظر سے بھی نہیں گزرا کچھ دن ہوئے میں نے اپنے ایک مضمون میں غالب کا یہ شعر لکھا کہ ؎

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے با اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

جب میں نے ان کو مضمون سنایا تو کہنے لگیں کہ اس کی جگہ فیضی کا یہ شعر لکھ دو ؎

دریاب کہ ما ندست نہ دل قطرہ خونے
آن قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

ہم سب خاموش بیٹھے ہوئے اسکی باتیں سُن رہے تھے اور وہ اپنی بیوی کا قصیدہ پڑھ رہا تھا لیکن میں نے کہہ دیا کہ "ان کو تو شاعرہ ہونا چاہئے اور وہ بہت خوب کہہ سکتی ہیں۔"

بس پھر اُنھوں نے سلسلہ شروع کیا۔

"ہاں ہاں موزونیت تو اس بلا کی پائی جاتی ہے کہ میں تم سے کیا کہوں کوئی مصرعہ ان کے سامنے بس پڑھ دیجئے پھر دیکھئے کیا کیا فرماتی ہیں اور جسوقت اُن پر شعریت طاری ہوتی ہے اُسوقت تو وہ جو کچھ کہتی ہیں ایک شعر ہوتا ہے کل رات کو آپ لیٹی ہوئی چاند کو دیکھ رہی تھیں اور اسقدر محو تھیں کہ کسی طرح اپنی نظریں نہ ہٹاتی تھیں میں نے پوچھا کہ "کیا کر رہی ہو" کہنے لگیں "چاند کی معصوم اور خنک دُنیا کو" اور پھر فوراً ہی فرمایا۔ ؏

"چاند کی ٹھنڈی شعاعیں لرزہ براندام ہیں"

اور پھر جب میں نے داد دی تو آپ نے شوخی سے کہا۔" اجی میں کس قابل ہوں سب آپ ہی کا فیض ہے"۔

تو یہ تم سچ کہتے ہو کہ ان کو شاعرہ ہونا چاہئے۔ واللہ اگر اُن پر ذرا توجہ کی جائے تو وہ بہت ہی لاجواب کہنے لگیں"۔

چلتے چلاتے ہم نے پھر کہیں کہدیا کہ" اُن سے مضمون لکھا یا کرو"۔

بس اُس نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور کہنے لگا۔

" وہ تو برا بر لکھتی ہیں کیا تم نے ان کا کوئی مضمون نہیں دیکھا عرصہ سے لکھ رہی ہیں اور کبھی میں نے اصلاح تک نہیں کی ہے ان کو تو ادبی ذوق کچھ اس طرح ہے گویا گھٹی میں ملا ہوا ہے اور بھائی اسی لئے تو میرا گھر جنت ہے میں تو تمام دُنیا کی راحتیں اپنے گھر کی چھوٹی سی جنت پر قربان کرتا ہوں"۔

ہم سب بمشکل تمام اجازت لیکر واپس آئے اور غور کرنے لگے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے کیا واقعی اسکی بیوی ایسی ہی ہے جیسی کہ وہ کہتا ہے؟ اور اگر اُس کا بیان صحیح ہے تو اس عورت کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل پرائز حاصل کرنے کا یقیناً کوئی حق نہ تھا آخر کار بہت کچھ غور و فکر کے بعد ہم سب اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس کی بیان کی ہوئی خوبیوں کو سو پر تقسیم کر دیا جائے لیکن اس کا حاصل تقسیم بھی ایسا تھا کہ وہ عورت ہزار دو ہزار میں ایک تھی اور تعجب تو یہ تھا کہ ان ایسے کندۂ ناتراش کو

ایسی بیوی کہاں سے مل گئی۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ ہم سب اسی نتیجہ پر پہونچے کہ اس شخص کو قابو میں لانے کی کنجی صرف یہ ہے کہ اس کی بیوی کی تعریفیں کرو اور اس سے کھاؤ چنانچہ ایک دن پھر بھی طے پایا کہ آج اس کے گھر پہونچ کر کچھ تسکم پری کیجائے لہذا اُن سے ملتے ہی میں نے کہا۔

" ارے بھائی اپنی بیوی کے ہاتھ کے ویسے ہی پان ایک مرتبہ پھر کھلا دو واللہ ابتک مزہ یاد ہے"۔

کہنے لگے۔" ابھی چلو اور وہ تو خود ہی تم لوگوں کو پوچھ رہی تھیں کہ خدا جانے وہ لوگ کیسے ہیں، بلکہ مجھ سے کہا بھی تھا کہ جاکر خیریت معلوم کر آؤ۔"

ہم لوگوں کو گویا منہ مانگی مراد ملی ان کے ہمراہ ہو لئے اور گھر پہونچتے پہونچتے راستہ میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ چار کی فرمایش بھی کر دی گھر پہونچتے ہی وہ تو اندر چلے گئے اور ہم سب باہر بیٹھے ہوئے طے کرنیلگے کہ آج دروازہ کے سوراخ سے دیکھا جائے کہ یہ حضرت اور ان کی بیوی صاحبہ دراصل ہیں کیا اور کتنے پانی میں ہیں، بات تو یہ بری تھی لیکن ہم لوگ ٹھیرے شیطانی لشکر کے رضا کار، ہمکو تو یہی فکر تھی کہ کسی طرح اپنے دوست کی اصلیت معلوم کریں لہذا ابتسم فوراً ہی دروازہ کے پاس گیا اور سوراخ سے گھر کی تمام کیفیت دیکھنے لگا، یہاں تک کہ ہم سب کو بھی شوق سوار ہوا اور

سب دروازہ کے پاس جمع ہو گئے جہاں سے اندر کی ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی۔

ہمارے دوست نے جاتے ہی ایک مسکینی کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا۔

" ذرا وہ تین آدمی آگئے ہیں اُن کو چائے پلانا ہے چوٹھا تو میں خود جلائے دیتا ہوں البتہ باقی کام تم کر دو اور کہو تو میں ہی بنا لوں۔"

بیوی نے ناک بھوں چڑھا کر سروتہ چارپائی پر ٹپخا اور کہنے لگیں۔

" مجھے یہ چوچلے اچھے نہیں لگتے تمہارے دوست ہمیشہ فاقہ ہی سے آتے ہیں ان کے گھروں میں کچھ نہیں جڑتا واہ یہ بھی کوئی بات ہے جاؤ تم ہی جو چاہے کرو میری جوتی کو غرض نہیں پڑی ہے کہ اس گرمی میں چوٹھے کے پاس جا کر مروں"

اس بیچارے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

" خدا کے لئے آہستہ بولو وہ لوگ یہیں کمرے میں بیٹھے ہیں میں خود سب کچھ کر لوں گا۔"

یہ کہکر وہ باہر آنے لگا اور ہم لوگ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اس نے آتے ہی کہا۔

" بھائی وہ تم سب کو سلام کہہ رہی ہیں اور مزاج پوچھتی ہیں۔ چائے ابھی آتی ہے جب تک میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔"

یہ کہکر وہ پھر گھر میں چلا گیا۔ اور ہم سب دروازہ کے پاس آگئے۔ بیچارے نے جاتے ہی پہلے تو تپیلی مانجنا شروع کر دی اور پھر آگ جلا کر پانی رکھدیا اس سے فارغ ہو کر وہ پھر دست بستہ بیوی کے حضور میں حاضر ہوئے کہ " ذرا دو چار پان ہی لگا دو " مگر وہ تو گویا خار کھائے ہوئے بیٹھی تھیں فوراً پاندان ان کے سامنے پٹخ کر کہا۔

" تم ہی بنا لو مجھ سے یہ نہیں ہو گا کہ دن بھر تنبولن بنی بیٹھی رہوں اور تمہارے یار دوستوں کو گلوریاں بنا بنا کر دوں کیا ان کمبختوں کی جیب میں ڈبیا بھی نہیں ہوتی، آگ لگے موؤں کو نہیں معلوم کہاں سے پھٹ پڑتے ہیں۔"

وہ بیچارہ بس یہی کہے جا رہا تھا کہ " خدا کے لئے چپکے چپکے خدا کے واسطے ذرا آہستہ وہ سب سُن رہے ہوں گے" اور وہ عورت بکے جا رہی تھی آخر بیچارہ نے خود ہی پان بنائے اور باہر آنے لگا ہم سب اپنی اپنی جگہ پر آگئے تھے: اُس نے پان دیتے ہوئے کہا۔

" لو بھائی تمہاری بھاوج کہتی ہیں کہ آخر ان پانوں میں کونسی ایسی بات ہوتی ہو جو یہ بہت پسند آئے ہیں وہی معمولی کتھا چونا پان ڈ بس " ہم نے کہا " مگر ان کو بنانے کی ترکیب تو سب کو نہیں آتی ۔ عرض ، مزے لگے

" ہاں یہی تو بات ہو اچھا میں چار لے آؤں "

وہ بیچارہ چار لینے گیا تو بیوی نے کہا " دیکھو آج تو جو کچھ ہوا وہ ہوا

مگر میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ آیندہ سے یہ دعوتیں نہ ہونے دوں گی۔ مجھے یہ روز روز کی باتیں اچھی نہیں لگتیں اُن مر بھکوں کا کیا ہے وہ تو چاٹنے کے لئے آہی جائینگے واہ اچھا تماشا بنا رکھا ہے کہہ دینا کہ اب نہ کبھی آئیں۔"

وہ بیچارہ چاے کی کشتی لئے ہوئے ہاں ہاں کرتا ہوا باہر آگیا اور کہنے لگا۔ "بیچاری نے جلدی جلدی چاے بنادی ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ میں اسوقت ناشتہ کا انتظام نہ کرسکی آپ لوگ معاف کیجیگا۔ دوسرے سہ پہر کی چاے میں جو ناشتہ ہونا چاہئے وہ ایمان کی بات ہے کہ ختم ہی ہوگیا ہے بہر حال پیو۔"

ہم سب نے اسوقت تو چاے کو زہر کا پیالہ سمجھکر کسی نہ کسی طرح پی ہی لیا۔ حالانکہ یہی معلوم ہو رہا تھا کہ جوتے کھائے ہیں لیکن اُس دن کے بعد سے انھوں نے بارہا کہا کہ "تمھاری بھاوج بہت یاد کرتی ہیں۔" لیکن ہم لوگوں نے اُدھر کا رُخ بھی نہ کیا۔ وہ اب بھی اپنی بیوی کی تعریفیں کرتا ہے اور ہم سب اس کو قابل رحم سمجھتے ہیں ہنستے اسلئے نہیں ہیں کہ خود بھی بیوی والے ہیں کہیں خدا کو یہ ہنسی بُری نہ معلوم ہو۔
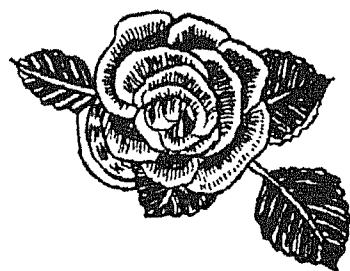
تار کا منی آرڈر

تار کا منی آرڈر

خداوند کریم واقعی بڑا مسبب الاسباب ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ جسکو دولت سے مالا مال کرنا چاہے چھپر پھاڑ کر دیسکتا ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ ہم گھر میں بند ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوئے بیٹھے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کریں، کس طرح اپنا خرچ پورا کریں۔ قرضخواہوں کے مارے ناک میں دم تھا گھر میں رہتے تھے تو نون تیل لکڑی کے تقاضے خودکشی پر آمادہ کرتے تھے۔ مجبوراً ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ نہ باہر نکلے اور نہ گھر میں بیٹھے بلکہ ان دونوں کے درمیان اپنی مردانی نشست گاہ میں اپنے کو ہر طرح محفوظ طریقہ پر مقفل کر لیا اور بیٹھ کر ہندوستان کے اقتصادی مسئلہ کو حل کرنے لگے ہندوستان کے موجودہ افلاس کو دُور کرنے کے طریقوں پر غور کرتے کرتے ابھی ہم پورن سوراجیہ ہی تک پہونچے تھے کہ کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی اور ہم نے نفس کی آمد و شد میں بھی احتیاط برتنا شروع کر دی تاکہ زنجیر کھٹکھٹانے والے کو ہماری موجودگی کا شبہ نہو اس لئے کہ یہ طے تھا کہ زنجیر کھٹکھٹانے والا یا تو مہاجن ہے ورنہ آغا ضرور ہے جسکا روپیہ معہ سود در سود آج ہی ہم کو ادا کر دینا چاہیئے۔ ہم دم بخود کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور زنجیر کھٹکھٹانے والا نہایت مستعدی کے ساتھ

نوٹنکی کا نگاڑا بجا رہا تھا۔ کبھی ہمارا نام لیکر آواز دیتا تھا اور کبھی اس زور سے زنجیر ہلاتا تھا کہ دروازہ کی چولیں تک ہل جاتی تھیں۔ جب ہم کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص بغیر دروازہ توڑے ہوئے نہ مانے گا تو ہم نے فوراً ملازمہ کی آواز بنا کر کہا۔

"اے کون ہے؟"

جواب ملا۔ "تار کا منی آرڈر ہے"۔

ہکو فوراً ہنسی آگئی اسلئے کہ مسعود کو اس قسم کا مذاق ہمیشہ سوجھا کرتا ہے اور وہ بارہا تار کا منی آرڈر والا معمولی منی آرڈر والا اور پوسٹ مین بن کر ہکو بے وقوف بنا چکے تھے لہذا ہم نے اس شرارت کو سمجھتے ہوئے اپنی اصلی آواز میں کہا۔

"ابے جا یہاں سے، اب کیا ہم ہمیشہ بیوقوف بنیں گے؟"

جواب۔ مرادآباد سے تار کا منی آرڈر آیا ہے، بابوجی کو بھیجئے۔

ہم۔ اچھا اب معاف کیجئے۔ بیوقوف بنانے کو ہم نے آپکو پہچان لیا۔

جواب۔ صاحب ہم کو دیر ہو رہی ہے گھنٹہ بھر سے چیخ رہے ہیں۔

ہم نے اُٹھکر دروازہ کھولتے ہوئے کہا "ابے مسخر۔۔۔" لیکن وہ واقعی منی آرڈر والا تھا جو ہم کو سلام کرتا ہوا کمرہ میں آگیا اور تار کے منی آرڈر کا فارم ہکو دیتے ہوئے کہا "پانچ سو پچاس روپیہ بابوجی جلدی

دستخط کر دیجئے۔

ہم۔ سنو تو بھائی کس کے نام ہے۔ کیا میرے نام ہے۔

وہ۔ اور کس کے نام ہوتا۔

ہم۔ اور کس نے بھیجا ہے؟

وہ۔ برجی مستری نے مراد آباد سے، بابو جی جلدی سے دستخط کر دیجئے۔

ہم۔ کہیں غلطی تو نہیں ---- مگر ہاں غلطی کیسے ہوتی نام تو میرا ہی ہے

برجی مستری ---- برجی مستری ---- رحمت کا فرشتہ برجی مستری،

برجی مستری صاحب ---- مکرمی برجی مستری صاحب ----

بھائی برجی مستری ---- عزیزم برجی مستری ---- مائی ڈیر برجی مستری

میری روح برجی مستری ---- میری جان ----

وہ۔ بابو جی لیجئے قلم دستخط۔

ہم۔ ہاں ہاں لو ---- برجی مستری ---- میری اُمیدوں کا سہارا

برجی مستری ---- برجی مستری زادلطفہٗ ---- لو بھائی

یہ دستخط اور یہ ایک روپیہ انعام لے جاؤ۔

اب ہمارے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی اور چند روپیہ تھے ہم نے ان کو بار بار گنا اور مبلغ پانچسو اُنچاس روپیہ پایا، ایک روپیہ انعام دے چکے تھے، روپیہ کی تعداد کے متعلق اب ہم کو اسقدر یقین تھا جسقدر

اپنے وجود کا، لیکن برجی مستری کو ہم ابتک یاد نہ کر سکے کہ یہ کون رحمت کا فرشتہ ہو لاکھ لاکھ ذہن پر زور دیا لاکھ لاکھ تمام مراد آبادی احباب کی صف میں برجی مستری کو تلاش کیا لیکن ان کا کہیں پتہ نہ تھا آخر ہم نے یہ فیصلہ کر لیا اور ہمارے دل نے گواہی دی کہ یہ برجی مستری خزانۂ غیب کے خزانچی ہیں اور خداوند کریم نے اپنے اس گناہگار بندہ کی مجبوریوں اور تباہیوں کا اس طرح خاتمہ کیا ہو۔ اب ہم سے نہ رہا گیا اور ہم آنکھوں میں آنسو بھر کر سجدہ میں گر پڑے

ہمارا دورِ ابتلا ختم ہو چکا تھا اور اب ہم بفضلہ چار پیسے والے تھے نہ ہم کو مہاجن کا ڈر تھا اور نہ آغا صاحب کا چنانچہ ہم نے سب سے پہلے ان ذلیل سر پر سوار رہنے والوں کا قرض ادا کیا اور اسکے بعد اپنے گھر کے اُس باورچی خانے کو آباد کرایا جو عرصہ سے ٹھنڈا تھا۔ گھر میں ایک چہل پہل شروع ہو گئی اور باہر مردانے میں بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کھاتے پیتے اِنسان کا گھر ہے۔

جنھے بھی کہا ہو سچ کہا ہو کہ یہ دُنیا بس روپیہ کا کھیل ہو۔ اب یہی نیکے نکھٹے جن بچوں کے پاس کل تک پھٹے ہوئے کپڑوں کی کمی تھی آج زرق برق لباسوں میں جگمگاتے پھر رہے تھے جن بیگم صاحبہ کا یہ حال تھا کہ قحط کی ماری ہوئی نظر آتی تھیں آج چکنی چپڑی بال بال موتی پروئے بیٹھی ہیں، خود ہم جو کل تک اس شرم سے باہر نہیں نکلتے تھے کہ دُنیا ہم کو پھٹے حالوں دیکھ کر کیا کہے گی۔ آج اسلئے باہر نکلتے ہیں کہ راہ چلتے ہم کو دیکھیں اور ہماری شان و شوکت کی

داد دیں۔ یہ سچ ہے کہ پانچسو روپیہ کی حیثیت ہی کیا ہے لیکن جس کے پاس پانچ کوڑیاں بھی نہوں اُس کے لئے تو یہ رقم قارون کا خزانہ ہے۔

اپنی اور بچوں کی حیثیت درست کرنیکے بعد ہم نے سب سے پہلے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے اُن تمام دوستوں کو ایک جگہ جمع کریں جو ہمارے افلاس کی نحوست سے ہمکو نہ صرف چھوڑ چکے تھے بلکہ ہمارے سایہ سے بھی پرہیز کرتے تھے آج خدا نے ہم کو اس قابل بنایا تھا کہ ان خود غرض مطلب شناس اور ابن الوقت دوستوں کو اپنے گھر بلا کر یہ ظاہر کرسکیں کہ انسان پر مصیبت ہمیشہ نہیں رہتی ہو اور کبھی نہ کبھی اُس کے دن ضرور پھرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ایک پُرتکلف دعوت کا انتظام کرکے اپنے تمام دوستوں کو مدعو کردیا اور گھر میں عورتوں نے بھی میلاد شریف کرکے عورتوں کو بلایا مختصر یہ کہ اندر سے لیکر باہر تک اچھی خاصی شادی بیاہ کی سی چہل پہل ہوگئی اور ہمارے وہ تمام دوست جمع ہوگئے جو کل تک ہم کو اپنی بزم میں جگہ دیتے ہوئے بھی پیشانی پر سینکڑوں بل ڈال لیا کرتے تھے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ آج تمام گذشتہ ذلتوں کی تلافی ہو رہی ہو اور واقعی آج ہم کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر کل تک ہم سب کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے تو آج سب کی آنکھوں کا تارہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ خوشی ہمارے لئے کچھ کم نہ تھی اور ہم دل ہی دل میں سیکڑوں شکر کے سجدے کر رہے تھے اور اپنے نادیدہ محسن یعنی بدھو مستری کے جان و مال کو دعائیں دے رہے تھے آج ہم زمانہ کی اس حالت سے

درس عبرت لے رہے تھے کہ ہمارے یہ بھی دوست ہیں جو ہمیشہ ہمارے "ہم نوالہ اور ہم پیالہ"
رہے لیکن وقت پڑنے پر ان میں سے ایک بھی نظر نہ آیا اور آج جب خدا نے ہمارے
دن پھیرے ہیں تو یہ سب پھر ہمکو دوستی کے فریب میں مبتلا کرنے کے لئے جمع ہیں
لیکن اسی دُنیا میں برجی مستری کی طرح کے خدا کے نیک بندے اور انسانی صورت
میں رحمت کے فرشتے بھی بستے ہیں جن سے نہ کبھی کی شناسائی نہ کسی قسم کے
تعلقات مگر آج اُس نیکی کے فرشتہ نے ہم کو حیات تازہ بخشی ہے ہم اس کے
اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے اور اگر ہم شریف ہیں تو اپنے
محسن برجی مستری کے اس احسان کو کبھی نہ بھولیں گے۔ ہم اپنے گھر کی چہل پہل
دیکھ کر خوش ہو رہے تھے ہم مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے لیکن ہمارا
دل چاہتا تھا کہ اس موقعہ پر برجی مستری بھی ہوتے تاکہ ہم ان کو سر آنکھوں پہ جگہ
دیکر اُن کو کلیجہ سے لگا کر دلکی بھڑاس نکال لیتے اور ان تمام دوستوں کو دکھاتے کہ
اگر دُنیا میں تم ایسے رہزن دوست ہوتے ہیں تو دُنیا اس قسم کے سچے
دوستوں سے بھی خالی نہیں ہے۔ ہم نے ابتک برجی مستری کو دیکھنا کیا معنی یہ نام
بھی کبھی نہ سُنا تھا لیکن آج ہمارے تخیلات نے برجی مستری کی ایک شکل پیدا
کر لی تھی اور ہم اُس پیاری پیاری شکل کی پرستش کر رہے تھے۔

دعوت بخیر وخوبی ختم ہوگئی اور تمام شرکاء دعوت ہماری سیر چشمی
اور عالی حوصلگی کی داد دیتے ہوئے اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے اب ہمارے

سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس غیبی امداد سے کس طرح فائدہ اُٹھائیں اسلئے کہ
اب ہمارے پاس پورے ڈھائی سو روپے محفوظ تھے اور یہ بالکل معمولی سی بات
تھی کہ اگر ان روپئوں کو بھی ہم خرچ کرنا چاہتے تو ایک ہی دن میں خرچ کرسکتے
تھے لیکن سوال یہ تھا کہ اس رقم کے ختم ہوجانے کے بعد آخر کیا کریں گے لہذا
ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ ایک معمولی سی اسٹیشنری کی دوکان کھول دیں اور اُسکا
نام اپنے محسن کے نام پر "مستری اینڈ کو اسٹیشنری فروش" رکھیں لیکن فوراً ہی
یہ خیال ذہن میں آیا کہ اگر پرچون کی دُکان رکھی جائے تو کم خرچ بھی ہوگی۔
اور بالانشین بھی۔ پھر اسی دوکان کو ترقی دیکر ہم بڑے تاجر بھی ہوسکتے ہیں
لیکن یہ بات ضرور تھی کہ پرچون کی دُکان ذرا ہمارے پوزیشن سے گری ہوئی
تھی لہذا ہم نے سوچا کہ بساط خانہ کی دُکان رکھیں اور اُس کا نام "برجی اینڈ کو"
رکھیں۔ مگر جب تخمینہ کیا تو ڈھائی سو روپیہ اُسکے لئے کافی نہ تھا۔ اسی طرح بزاز کی
دُکان اور انگریزی دواؤں کی دُکان کا مسئلہ خارج از بحث ہوگیا، کتابوں کی
تجارت پر سب سے زیادہ دل نے گواہی دی اسلئے کہ یہی وہ تجارت ہے کہ جس سے
نوع انسان کی خدمت بھی ہوتی ہے اور اسکو بہت کم سرمایہ سے شروع بھی کیا
جاسکتا ہے لیکن جوتوں کی تجارت کے خیال نے بھی ایسے سبز باغ دکھائے کہ
اب ہم نے "برجی بوٹ ڈپو" اور "برجی شو فیکٹری" کا موازنہ شروع کردیا اور
ان دونوں کے ہر رُخ پر کافی غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ

"برجی شو فیکٹری" بسم اللہ کر کے کھول دیں۔ پھر دیکھا جائے گا اللہ مالک ہے۔ روپیہ ہونے کی دیر ہوتی ہے اور جہاں روپیہ ہاتھ میں آیا بس تمام انتظامات خود بخود ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دُکان بھی کرایہ پر لیلی سنگر کی مشین بھی پہلی قسط ادا کر کے لے آئے کاریگروں کا بھی انتظام ہو گیا اور اب ہم برجی شو فیکٹری کے پروپرائٹر تھے، لیکن اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جس خدا نے یہ تمام سامان اپنی غیبی امداد سے کر دیا ہے وہی اس کام میں فائدہ بھی پہونچائے اور جلد جلد دُکان کو چلائے اسلئے کہ اب تمامتر دارومدار آمدنی پر تھا اور دُکان کی آمدنی ہی سے دُکان کو چلایا جا سکتا تھا۔ جہاں تک ہمارے سرمایہ کا تعلق تھا وہ سب اسی دُکان میں لگ چکا تھا اور اب ڈھائی سو روپیہ میں سے صرف پندرہ روپیہ گھر کے خرچ کے لئے پڑے ہوئے تھے باقی سب "برجی شو فیکٹری" کی نذر ہو گئے تھے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جو کام بھی ہو رفتہ رفتہ چلتا ہے اور ہم کو اس کا پورا یقین تھا کہ جب خدا نے اس حد تک ہماری حالت بدلی ہے تو وہ ضرور اس دُکان کو ہمارے دن بدل دینے کا بہانہ بنائے گا اور یہ جوتے کی کمپنی کامیاب ہو کر رہے گی۔

ہم کبھی یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ایک دم سے ہم اس قابل بھی ہو سکیں گے کہ اپنے پیروں پر از سر نو کھڑے ہو سکیں لیکن آج وہی ناممکن صورت ممکن ہو کر عملی صورت میں ہمارے پیش نظر تھی اور ہمارا دل چاہتا تھا کہ اُن تمام دوستوں کو

جو ہماری طرف سے بالکل مایوس ہوگئے تھے فرداً فرداً بلاکر دکھائیں کہ ہم کیا ہیں، کیا ہورہے ہیں، کیا ہوسکتے ہیں اور کیا ہو جائیں گے؟

ہم کو معلوم تھا کہ ہمارے اس ایکدم سے رنگ بدلنے پر ہمارے تمام دوست محو حیرت تھے۔ اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے یعنی ؏

"یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا"

آج سے دو روز قبل ہم کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہ تھے، لیکن دو ہی دن میں ہم نے پرتکلف دعوتیں بھی کرڈالیں دُکان بھی کھول لی اور آج نہایت شان سے اپنی دُکان میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے ہمارا دل چاہتا تھا کہ وہ وجاہت پسند دوست اب ہم سے ملنے آئیں جو ہم کو اپنی سوسائٹی کے دامن پر ایک بدنما داغ سمجھتے تھے اور اب آکر دیکھیں کہ کیا ہم ہی اُن کی سوسائٹی کے لئے باعث فخر نہیں ہیں اور کیا ہم ہی سے انکی سوسائٹی کی وقعت میں چار چاند نہیں لگ جاتے۔

ہم ان ہی خیالات میں محو حقہ کے کش لے رہے تھے کہ دھوئیں کی چادر سے ہم کو محسن آتا ہوا نظر آیا اور ہم "اخاہ محسن" کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ محسن آتے ہی ایک لوہے کی کُرسی پر آرام کرسی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور ہم آرام کرسی پر نہایت شان سے ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے۔ محسن نے ہماری دُکان کے چاروں طرف اوپر نیچے ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اور کہنے لگا۔

"تم نے تو ایک دم سے بڑی ہوا باندھ دی"

ہم۔ (ایک فخر آمیز انکسار کے ساتھ) کچھ نہیں یہ سب خدا کی ایک ادنیٰ سی عنایت ہے، اور تمھاری دُعاؤں کا اثر ہے۔

محسن۔ خیر بھائی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ترقی دے اور تمھیں کامیاب کرے۔

ہم۔ آمین، انشاء اللہ تھوڑے ہی دنوں میں تم اس دکان کو باقاعدہ کارخانہ دیکھو گے۔ ابھی تو ابتدا ہی اور صرف میں تنہا کام کرنے والا ہوں اگر ابھی سے ادھر ادھر روپیہ لگا دیتا تو حماقت ہوتی۔

محسن۔ لیکن تم کو ذرا ظاہری شان و شوکت اور نمائش کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے کہ دُکان جاذبِ نظر ہو۔

ہم۔ تم اس معاملہ میں مشورہ نہ دو یہ بزنس ہے۔ اور تم بزنس کے اُصول سے واقف نہیں ہو۔ میں نے تو برسوں سر کھپایا ہے تب جا کر یہ دوکان کھولی ہے۔ بزنس کا یہ اُصول ہمیشہ یاد رکھو کہ تنزل سے ترقی کی طرف جانا چاہئے۔ ترقی سے تنزل ہمیشہ کاروبار کو فیل کر دیتا ہے تم کو نہیں معلوم کہ اس معاملہ میں مجھکو کس قدر تجربہ ہے تم لوگ میرے پھٹے حالوں کے دیکھنے والے ہو تم لوگ مجھکو ایک قابلِ رحم مفلس سمجھتے تھے لیکن میں اپنے اُن ہی پھٹے حالوں میں اپنا اور بال بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس دُکان کی تیاریاں کر رہا تھا اور تم ہی سچ بتاؤ کہ اگر میں نے یہ طریقہ نہ اختیار کیا ہوتا تو آج یہ دُکان کہاں سے ہوتی۔ اب تم کو نہیں معلوم کہ اس دکان

کے لئے میرے ذہن میں کتنا عظیم الشان پروگرام ہے۔ لیکن میں زینہ بہ زینہ اس پروگرام پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ تمہاری دُعا سے روپیہ کی کمی نہیں ہے، لیکن اس روپیہ کے لئے جو مصرف ہونا چاہئے اُسکو میں تم سے زیادہ سمجھ سکتا ہوں تم کو کیا معلوم کہ بزنس میں انسان کو کیا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔؟

محسن۔ ارے یار تم بڑے گہرے نکلے ہم نے تم کو کبھی اسقدر ٹھوس قسم کا آدمی نہیں سمجھا تھا۔

ہم۔ تو وہ تم کیونکر سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ میں نے اپنا ہمیشہ یہی اُصول رکھا کہ جو کچھ کیا جائے نہایت خاموشی کے ساتھ اور قبل از وقت ڈینگ نہ ہانکی جائے اب یہی دیکھو کہ تم کو ایک دم سے یہ دُکان دیکھ کر خوشی ہوئی ہے یا اگر میں ہمیشہ دُکان کا تذکرہ کرتا بڑھ بڑھ کے باتیں بناتا اور اسکے بعد کچھ بھی کرتا مجھکو تو یقین ہے کہ تم کو اُس صورت میں ہرگز خوشی نہ ہوتی۔

محسن۔ بھئی واللہ مجھکو تو تعجب ہو رہا ہے کہ اتنے گہرے تجارتی انسان تھے اور مجھکو کیا کسی کو تم پر شُبہ ہوا۔

ہم۔ تجارتی انسان کبھی اپنے راز کو افشا نہیں کرتا اور بزنس کا یہ اُصول یاد رکھو کہ جو ڈینگیں ہانکے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

محسن۔ خیر بھائی واللہ بڑی مسرت ہوئی۔ خداوندِ کریم تمکو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ اچھا اب چلدیئے، ہاں اسوقت آنے کا مقصد یہ تھا کہ کوئی تار

منی آرڈر تو نہیں آیا۔

ہم۔ (ایک قہقہہ لگا کر) بدمعاش کہیں کے ------ شریر ---- تم شرارت سے کبھی باز نہیں آؤگے۔ تم کو کیسے معلوم ہوا۔

محسن (سنجیدگی سے) واقعی مذاق نہیں ایک منی آرڈر تمھارے پتہ پر مراد آباد سے منگایا ہے۔ اُسی کو پوچھ رہا ہوں۔

ہم۔ اور ظالم کے چہرے پر ذرا بھی ہنسی کا نشان نہیں ---- ہا ہا ہا ہا ---- شریر ---- ہا ہا ---- ہو بڑے پاجی ---- ابے سچ بتا تجھے کیسے معلوم ہوا؟

محسن۔ بھائی قصہ یہ ہے کہ مراد آباد کا ایک ٹھیکہ دار برجی مستری میڈیکل کالج میں پاور ہاؤس کا ٹھیکہ لینے والا ہے۔ اُس نے ٹنڈر بھیجا ہے اور یہ زرِ ضمانت مجھکو بھیج رہا تھا۔ میں الہ آباد جا رہا تھا تو میں نے تمھارے پتہ پر منگایا ہے اسکو ابتک آجانا چاہئے تھا ورنہ آج آجائے گا۔

ہم۔ ہا ہا ہا ---- ابے ---- ہا ہا ---- بس اب رہنے بھی دو ہم کو اُلو بنانے آیا ہے۔ تجھے خدا کی قسم سچ بتا کس نے تجھ سے کہا۔

محسن۔ مذاق نہیں واللہ برجی مستری سے میں نے تمھارے ہی پتہ پر روپیہ طلب کیا ہے۔

ہم۔ خیر اب مذاق تو ہوا ختم یہ کہو کہ تم کو کیسے خبر ہو گئی۔ یہ بات تو ابتک

کسی کو نہیں معلوم؟

محسن۔ آپ بھی عجیب چیز ہیں میں کہہ تو رہا ہوں کہ خود میں نے برجی مستری کو لکھا ہے کہ روپیہ بذریعہ تار تمھارے پتہ پر بھیج دے اور مجھکو کیسے معلوم ہوتا؟

ہم۔ گدھا کہیں کا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بس اب دل لگی ختم ہو گئی۔

محسن۔ یقین نہیں آتا تو لو یہ خط دیکھو برجی مستری کا خط ہے۔ اُسنے لکھا تھا کہ جتنا روپیہ ضمانت میں طلب کیا گیا ہو مجھکو لکھو میں بذریعہ تار بھیج دوں میں نے اُسکے جواب میں لکھا کہ میں تو الہ آباد جا رہا ہوں۔ وہ ساڑھے پانچسو روپیہ بذریعہ تار فوراً تمھارے پتہ پر بھیج دے۔

ہم۔ یہ بھی اچھی گڑھی۔

محسن۔ لو یہ خط دیکھو میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔

یہ بات خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ وہ خط دیکھکر ہماری روح قفس عنصری سے پرواز کیوں نہ کر گئی۔ لیکن اتنا ہم کو ضرور ہوش ہے کہ خط دیکھنے کے بعد ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ اس قسم کا اندھیرا تھا کہ ہم محسن کی صورت نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ہم نے نہایت مضبوطی سے کام لے کر اُس وقت تو محسن کو یہ کہکر ٹال دیا کہ "ابھی تک تو کچھ نہیں آیا ہے" اور دوسرے دن باپ دادا کی کمائی کا آخری حصہ یعنی مکان کے سامنے پڑی ہوئی زمین ہم سے اس طرح

جدا ہو رہی تھی کہ اس پر ایک الٹا رکھا ہوا ڈھول پیٹا جا رہا تھا اور
ایک دفتی کے ٹکڑے پر لکھا ہوا تھا:۔
" قطعہ آراضی برائے نیلام"
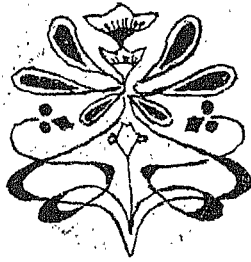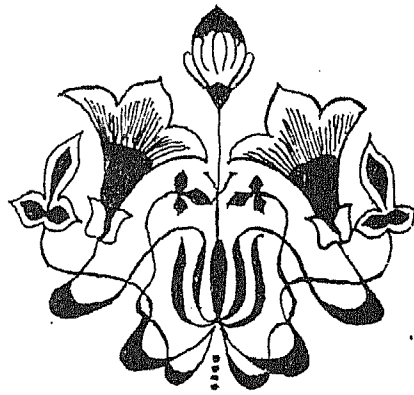
امرود کا چور

امرود کا چور

افراد ڈراما

جمیل ---------- ایک شاعرانہ ذہنیت کا نوجوان
پروین ---------- جمیل کی محبوب بیوی
شکیل ---------- جمیل کا خورد سال بچہ
بدھو کی ماں ---------- ملازمہ

منظر

(جمیل ایک امرود اُچھالتا ہوا مکان میں داخل ہوتا ہے اور اسکو میز پر رکھکر چاقو کی تلاش میں باورچی خانہ جاتا ہے۔ پروین ایک چارپائی پہ بیٹھی ڈلی کاٹ رہی ہے شکیل میز کے نیچے بیٹھا جمیل کے جوتوں سے کھیل رہا ہے بدھو کی ماں صحن میں جھاڑو دے رہی ہے اور کچھ گنگناتی جاتی ہے جمیل کی ایک آواز پر سب چونک پڑتے ہیں)

جمیل۔ کس نے اُٹھایا؟
پروین۔ (حیرت زدہ ہوکر) کیا؟
جمیل۔ ارے ابھی یہاں رکھا تھا۔

پروین۔ کیا رکھا تھا۔
جمیل۔ اسجگہ یہیں میز پر میں نے خود رکھا ہو۔
پروین۔ کچھ کہو تو سہی کیا رکھا تھا۔
جمیل۔ ارے کہا تو میں نے امرود۔ ابھی میں لایا تھا، ابھی میں نے خود اپنے
ہاتھوں سے رکھا ہو۔
پروین۔ امرود کیسا؟
جمیل۔ سفید سی مائل پیلے رنگ کا گول عمدہ تازہ دو پتوں دار۔
پروین۔ کہاں سے لائے تھے؟ کب لائے تھے؟ کچھ کہو تو۔
جمیل۔ اجی میں چُرا کر لایا تھا مگر وہ ہوا کیا؟ ہائے کیسا شاداب تھا۔
پروین۔ جائیگا کہاں؟ لائے ہو تو یہیں ہوگا؟
جمیل۔ اب تم ڈھونڈھو میں تو ایک ایک چیز دیکھ چکا۔ کیا اسکی خوشبو تھی؟
پروین۔ (بدھو کی ماں کو آواز دیکر) ذرا میز کے نیچے۔ تخت کے اوپر بکس کے
پیچھے تو بھی دیکھ لے شاید کہیں گر پڑا ہو۔
بدھو کی ماں۔ بیگم صاحبہ میز کے نیچے تو ابھی جھاڑو دی ہو ہوتا تو اس کوڑے
میں ہوتا۔ تخت کے اوپر دیکھئے کوئی چیز ہے نہیں بکس کے پیچھے لائٹے دیکھلوں؟
جمیل۔ تو گویا میں جھوٹا ہوں؟ پاگل ہو گیا ہوں! دماغ خراب ہے؟
بدھو کی ماں۔ نہیں میاں خدا نہ کرے میں تو امرود سے کہتی ہوں کہ کیسا غائب ہوا ہو۔

پروین ۔ اور کوئی آس نہ پاس ۔
جمیل ۔ تو کیا اسکے خود پیر لگ گئے تھے؟ زبانی جمع خرچ کر رہی ہیں یہ نہیں ہوتا کہ اُٹھکر ڈھونڈھ دیں ۔
پروین ۔ اے واہ جیسے میں نے کھو دیا ۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ کیسا موا امرود اور کیسا کچھ مجھپر کیوں غصّہ آ رہا ہے ۔
جمیل ۔ غصّہ نہ آئے تو اور کیا ہو ۔ گھر ہے کہ سرائے ۔ چیز رکھی اور اُڑ گئی آنکھوں کا کاجل نکالا جاتا ہے ۔
پروین ۔ تو کس نے چُرایا ۔ میں نے ؟
جمیل ۔ میں کیا جانوں ، اب یہاں میرے اور تمھارے سوا کون تھا ۔
بدھو کی ماں ۔ میاں بدھو کی جان کی قسم اگر میں نے امرود دیکھا بھی ہو تو آنکھیں پھوٹ جائیں ۔
جمیل ۔ تو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا ۔
پروین ۔ تم یاد تو کرو کہ لائے بھی تھے یا نہیں ، اور کہیں کھا کر تو نہیں بھول رہے ہو ۔
جمیل ۔ لاحول ولا قوۃ تم لوگ مجھ کو دیوانہ سمجھتی ہو یا کیا ۔
پروین ۔ تم کو غصّہ چلا آ رہا ہے ۔ ذرا اپنی جیبیں دیکھ لو یا باورچی خانہ میں دیکھ لو ۔

جمیل۔ (جیبیں دیکھکر) جیب میں امرود ہوتا اور اُسکی خوشبو ناک میں نہ آتی گویا امرود کیا ہوا اگا جرہ ہو گیا۔

پروین۔ اچھا تو باورچی خانہ میں ڈھونڈھ آؤ شاید وہیں رہگیا ہو۔

جمیل۔ مگر تم کو قسم ہو کہ بیٹھے ہی بیٹھے حکم چلائے جاتا یہ نہیں کہ ذرا ڈھونڈھ دیں۔ اگر مل گیا تو میں اکیلا تھوڑی اس کو زہر مار کر لوں گا۔ تم کو کھلاؤں گا شکیل کو دوں گا۔ مگر کہیں ملے بھی تو کمبخت۔

بدھو کی ماں۔ کھو گیا تو جانے دیجئے مدے کو میں ایک پیسہ کا اور لائے دیتی ہوں۔

جمیل۔ بیوقوف کہیں کی! بدتمیز کہیں کی!! نالائق کہیں کی!!! چپ۔

بدھو کی ماں۔ حضور میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔

پروین۔ اچھا چپ رہو غصہ میں ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی۔

جمیل۔ یعنی یہ گدھی کہتی ہو کہ ایک پیسہ کا لا دیگی۔ ایک پیسہ تو ایک پیسہ ایک روپیہ کا بھی نہیں ملسکتا اور تم میری زبان کے آگے خندق کہتی ہو اسکی بدتمیزی پر غور نہیں کرتیں۔

پروین۔ تو اس کو کیا معلوم کہ یہ امرود سونے کا تھا وہ سمجھی کہ ہی پیسہ کے آٹھ والے ہوں گے۔

جمیل۔ اسی پر مجھکو غصہ آیا ہو کہ اس نے مجھکو پیسہ کے آٹھ والے امرود

کھانیوالا ذلیل آدمی سمجھا۔ وہ امرود خسرو باغ الہ آباد سے مولوی اشفاق اللہ خاں کے بھتیجے نے بھائی محمود کو بھیجا تھا اور ان کو لکھدیا تھا کہ وہ مجھکو بھی دیدیں۔

پروین۔ اور اُن کو ایک امرود کے لئے لکھتے ہوئے شرم بھی نہ آئی؟

جمیل۔ شرم! اس میں شرم کی کونسی بات تھی شہر لکھنؤ میں اُن کے ہزاروں دوست ہیں انھوں نے لکھا تھا کہ میرے دوستوں میں تقسیم کردو۔ لہٰذا حصہ رسد ایک مجکو بھی مل گیا مگر میری قسمت میں نہ تھا اس کو کیا کیا جائے۔

پروین۔ اچھا تو تم سمجھ لو کہ تم کو نہیں ملا۔

جمیل۔ یہ سمجھکر ملا ملایا امرود کھودوں۔

پروین۔ وہ تو کھو ہی گیا ہے۔

جمیل۔ کیسے کھو گیا ہے ۔۔۔۔۔ اگر ڈھونڈھا جائے تو ابھی ملے ہیں ملے۔

پروین۔ توبہ ہے۔ امرود نہوا سوئی ہوگئی اب موئے کو کہاں ڈھونڈھا جائے۔

جمیل۔ تم پلنگ سے اُٹھو تو بتاؤں۔

پروین۔ (جھنجھلا کے اُٹھکر) بتاؤ۔

جمیل۔ اپنے پائجامہ کے پائنچے جھاڑو۔

پروین۔ پائنچوں میں کہاں سے آیا؟

جمیل۔ جو میں کہتا ہوں وہ کرو ممکن ہے کہ پائنچوں میں ہو۔

پروین۔ (دونوں پائنچوں کو جھٹک کر) لو۔
جمیل۔ اچھا اب تکیہ کے نیچے دیکھو۔
پروین۔ (تکئے ہٹا کر) دھرا ہو یہاں۔
جمیل۔ اچھا۔ اچھا۔ ہاں شکیل کے بستر پر بھی لگے ہاتھ دیکھ لو۔
پروین۔ اور شکیل ہے کہاں؟
جمیل۔ ہوگا کہیں پہلے امرود دیکھ لو۔
پروین۔ واہ اُسکی بڑی دیر سے خبر نہیں ہو۔
جمیل۔ باہر ہوگا پہلے امرود ڈھونڈھو۔
پروین۔ چولھے میں گیا امرود کہیں میرا بچہ سڑک پر نہ چلا جائے۔
جمیل۔ نہیں جائے گا اُس کا لحاف اُٹھا کر امرود دیکھو۔
پروین۔ ارے میں دیکھ دوں گی پہلے اس کو لادو۔
جمیل۔ لاحول ولاقوۃ میں خود دیکھے لیتا ہوں۔
پروین۔ (بدھو کی ماں سے) ذرا تو جا کر اس کو اُٹھا لا۔
جمیل۔ جی ہاں جسمیں میرا امرود باہر جا کر کھالے۔
بدھو کی ماں۔ میاں میری تلاشی لے لیجئے بدھو کی قسم میں نے امرود نہیں لیا۔
جمیل۔ کھا گئی ہوگی اچھا لا تیرا منہ سونگھوں۔
بدھو کی ماں۔ (منہ کھول کر) لیجئے۔

جمیل۔ (منہ سونگھ کر) استغفراللہ کبھی منہ بھی صاف نہیں کرتی دُور ہو۔

پروین۔ (ہنس کر) تو تم سے کس نے کہا تھا کہ منہ سونگھو اب میرا بھی سونگھنا ہو تو سونگھ لو۔

جمیل۔ بس معاف رکھو تمھارا منہ سونگھ کر مر ہی جاؤں گا۔

پروین۔ اے واہ تو کیا میرا منہ بھی بدبُودار ہے۔

جمیل۔ خیر خوشبودار سہی مگر میرا امرود۔

پروین۔ اچھا بدّھو کی ماں تو شکیل کو لے آ۔

جمیل۔ ہاں وہ جاتی ہو تم ذرا جہاں جہاں میں کہوں دیکھ تو لو۔

پروین۔ بتاؤ اب کہاں دیکھوں۔

جمیل۔ پاندان میں، پٹاری میں، اور کتابوں کے پیچھے۔

پروین۔ (پاندان کھولکر) اس میں کہاں سے آیا۔

جمیل۔ اچھا پٹاری میں دیکھو۔

پروین۔ (پٹاری کھول کر) نہ اس میں ہو۔

جمیل۔ کتابوں کے پیچھے۔

پروین۔ (کتابیں ہٹا کر) نہ یہاں ہے۔

(بدّھو کی ماں آتی ہے)

بدّھو کی ماں۔ بھیّا! ہر نہیں ہیں۔ میں نے سب جگہ دیکھ لیا۔

جمیل۔ اچھا میں فال کھولتا ہوں۔
پروین۔ چولھے میں گئی فال میرے بچّے کا پتہ نہیں۔
جمیل۔ ابھی ڈھونڈھ لاؤں گا پہلے ایک کیل اور ایک جوتا لاؤ۔
فال کھولوں۔
پروین۔ اچھا تم شکیل کو ڈھونڈھ لاؤ میں امرود ڈھونڈھے دیتی ہوں۔
جمیل۔ اب تو میں فال کھولوں گا۔ لاؤ جوتا، لاؤ کیل۔
پروین۔ کہیں گاڑی گھوڑے کے نیچے اُسکے دشمن کچل نہ جائیں۔
جمیل۔ (بدھو کی ماں سے) ایک جوتا لاتی ہو کہ نہیں اور ایک کیل۔
بدّھو کی ماں۔ میاں جوتا کہاں سے لاؤں؟
جمیل۔ میز کے نیچے سے اُٹھا لے۔
بدّھو کی ماں۔ (میز کے نیچے جوتوں پر پڑے ہوئے میز پوش کو ہٹاکر)
بھیّا تو یہ سو رہے ہیں۔
پروین۔ کہاں؟
بدّھو کی ماں۔ یہ ہیں یہاں جوتوں پر پڑے بےخبر سو رہے ہیں۔
پروین۔ (شکیل کو اُٹھاکر) میرا بچہ کس بُری گت سے پڑا ہوا تھا۔
جمیل۔ (شکیل کو دیکھکر) دیکھنا تو اس کے ہاتھ میں کیا بھرا ہے؟
پروین۔ (ہاتھ دیکھکر اور قہقہہ لگاکر) ایسے امرود ہی امرود۔

جمیل۔ کیا امرود؟

پروین۔ ہاں امرود!

جمیل منہ کھول کر رہ جاتا ہے۔ پروین ہنستی ہے، تسکین آنکھیں کھولدیتا ہے اور ہاتھ چاٹنے لگتا ہے۔ بڈھو کی ماں بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

بوا جعفری خانم

بوا جعفری خانم

اب تو خیر ہماری ہی بیگم صاحبہ کی حکومت ہو لیکن یہ اُس زمانہ کا
ذکر ہی جب باورچی خانہ کی سولہ آنہ مالک و مختار بوا جعفری خانم تھیں اور
ہمارے اغراض و مقاصد بھی آجکل سے زیادہ باورچی خانہ اور بوا جعفری خانم
سے وابستہ تھے۔ سب سے پہلے ضرورت اِس بات کی ہی کہ بوا جعفری خانم کی
پوزیشن واضح کردیجائے تاکہ آپ اندازہ کرسکیں کہ وہ کس پایہ کی عورتوں
میں سے تھیں اور ان کا کیا مرتبہ تھا۔ تھیں تو وہ تین روپیہ ماہوار اور کھانے پر
ملازم اور اپنے عہدہ کے اعتبار سے بھی ماما سے زیادہ کچھ جانیکی مستحق
نہ تھیں۔ لیکن اُنھوں نے ہماری والدہ صاحبہ کا کچھ ایسا اعتماد حاصل کرلیا
تھا کہ وہ ہمارے گھر کی اسپشل منیجر معلوم ہوتی تھیں اور دیکھنے والے ان کو
ہماری والدہ صاحبہ کی وزیر اعظم سمجھ سکتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ باورچی خانہ
کی تو وہ گویا مالک ہی تھیں اور وہاں گویا ان ہی کے نام کا سکہ چلتا تھا
لیکن چونکہ وہ گھر کے دوسرے انتظامات اور ہمارے خاندانی سیاسیات میں بھی
دخل رکھتی تھیں لہذا انھوں نے باورچی خانہ ہی کو اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر کیا تھا
اور وہیں تمام معاملات پیش ہوکر منظور یا نامنظور ہوتے تھے۔ چنانچہ اُس
زمانہ میں ہمارے باورچی خانہ کی حیثیت بالکل دارالعوام کی سی تھی جسکی

صدر بوا جعفری خانم تھیں۔

شادی بیاہ کے معاملات، ہلوگوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل، معمولی تنازعات، بڑے بڑے خاندانی اختلافات، آمدنی اور خرچ کے حسابات، بجٹ کی منظوری، مختصر یہ کہ تمام دُنیا کے قصے، باورچی خانہ ہی میں طے پاتے تھے اور بوا جعفری خانم ہی طے کرتی تھیں لاکھ کوئی اختلاف کرے اپنا سر دے مارے دوسروں کا سر توڑ دے اپنی بوٹیاں نوچے، دوسروں کی بوٹیاں چبا لے لیکن نتیجہ ہمیشہ یہی برآمد ہوتا تھا کہ بوا جعفری خانم کی تجویز والدہ صاحبہ کی نظروں میں مناسب ترین ہوتی تھی۔ اور والد صاحب تو گویا اس دار العوام کی کارروائی پر رسمی طور سے محض تصدیقی دستخط فرمادیا کرتے تھے۔ بہرحال بوا جعفری خانم کا فرمان ہم سب کا نوشتۂ تقدیر بن کر رہتا تھا اور باورچی خانہ کا فیصلہ قطعی ہوتا تھا جسکی کہیں اپیل بھی نہیں ہو سکتی تھی ایسی صورت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے گھر میں باورچی خانہ کو کیا اہمیت حاصل ہوگی!

ہوتا یہ تھا کہ باورچی خانہ کی محدود گنجائش میں کھانے پکانے کے سازو سامان کے علاوہ کہیں تو کسی کی چارپائی پڑی ہوتی تھی اور کہیں کسی کی کرسی کوئی پیڑھے ہی پر بیٹھ جاتا تھا اور کوئی اس سرکار میں ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا بہرحال تمام گھر سمٹ سمٹا کر جس ایک مرکز پر نظر آتا تھا

وہ باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانہ تو خیر وہ تھا ہی لیکن اسکے علاوہ وہ ملاقات کے کمرے، آفس، خوابگاہ، اسپتال، درزی خانے، رنگریزی کے کارخانے ڈریسنگ روم، بلکہ بعض اوقات بچوں کے غسل خانے اور پاخانے کی حیثیت بھی اسی باورچی خانہ کو حاصل ہوتی تھی، چولھے کے داہنی جانب رکھا ہوا پٹرہ گویا کرسی صدارت تھی جسپر بوا جعفری خانم بصد شان وشوکت جلوہ فرما رہتی تھیں اور ان کے اقبال سے تمام باورچی خانہ کے کام ہوتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے معاملات بھی طے ہوجایا کرتے تھے وہ اپنے اسی پٹرے پر بیٹھی ہوئی چولھا ہانڈی بھی دیکھتی تھیں، گھر کے دوسرے ملازموں کی نگرانی بھی کرتی تھیں، بچوں کی دیکھ بھال بھی فرماتی تھیں، گوشت والے اور دودھ والی پر غصہ بھی کرتی تھیں، گھی والے سے حسابات بھی طے فرماتی تھیں، ہم سب کو تنبیہ بھی کرتی تھیں، گیلی لکڑیوں کی شکایت میں لکڑی والے کی شان میں قصیدہ بھی فرماتی تھیں، خود لکڑیوں کو گالیاں بھی دیتی تھیں، طوطے کو سبق بھی پڑھاتی تھیں، اور کُتے کو "کم آن" اور "گو آن" کا مفہوم بھی سمجھاتی تھیں۔ موسیقی کی مشق بھی فرماتی تھیں اور کہانی بھی کہتی تھیں، گھر کے سیاسیات پر لکچر بھی دیتی تھیں اور اگر ضرورت پیش آئے تو قسمت کو وہیں بیٹھ کر رو بھی لیتی تھیں، ہر قسم کے مشورے اپنے اسی پٹرے پر سے دیتی تھیں اور تمام احکام وہیں سے نافذ ہوتے تھے مختصر یہ کہ ہمارے

گھر کا مرکز باورچی خانہ تھا اور باورچی خانہ کا مرکز وہ پٹرا جس پر بوا جعفری خانم تشریف رکھتی تھیں۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ ہم مبالغہ کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ تو آپ کی سمجھ کا قصور ہوگا ورنہ واقعہ تو یہی ہے کہ بوا جعفری خانم کی خداداد قابلیت اور اعلیٰ تدبر نے ہمارے باورچی خانہ کو دنیا بھر کی حیثیتیں بخشدی تھیں اور خود ان کا یہ حال تھا کہ وہ ہر ضرورت پر اس ضرورت کے عین مطابق کار آمد وجود ثابت ہوتی تھیں، مثلاً کسی نوکر نے غبن کیا اور جرم اسپر ثابت ہوگیا۔ اُسوقت اگر کوئی بوا جعفری خانم کے تیور ان کا انداز بیان ان کے ذمہ دار الفاظ اور اُن کی آواز کی گرج دیکھتا تو صرف یہی سمجھ سکتا تھا کہ آپ یقیناً تھانہ دار ہیں خود ملزم کا تو یہ حال ہوتا تھا کہ گویا کسی کوتوالی میں کھڑا ہے اور کوتوال صاحب کا مقابلہ ہے اسی طرح اگر کسی بچہ کو چوٹ آگئی ہو تو بوا جعفری خانم ہی کی طبی امداد سب سے پہلے طلب کیجاتی تھی اور وہ بھی اس مستعدی کے ساتھ مرہم پٹی فرماتی تھیں کہ گویا پانچ سال تک میڈیکل کالج میں پڑھ چکی ہیں اور سینکڑوں مریض آپکے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اور اسی طرح انجینیری، قانون، ادبیات، سیاسیات مذہبیات، معاشیات، فلکیات، معدنیات، اور نہیں معلوم کن کن واہیات خرافات پر وہ پورا عبور رکھتی تھیں اور کہیں بھی وہ مجبور نظر نہ آتی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ گھر کا ہر چھوٹا بڑا ہر آیا گیا ان کا احترام کرتا تھا اور جس نے

کبھی ان کو نظر انداز کیا وہ اپنی سزا کو بھی پہنچ جاتا تھا ۔

ان کی مزاجی حالت عام انسانوں کی طرح ہر وقت مختلف ہوتی تھی ۔ اور چونکہ تمام گھر ان ہی کے تابع فرمان تھا لہذا ان کی مزاجی حالت کا اثر تمام گھر پر پڑتا تھا اگر کبھی وہ خوش ہوتی تھیں تو گھر بھر میں چہل پہل نظر آتی تھی اور خود وہ باورچی خانہ ہی میں بیٹھے بیٹھے نغمہ سرائی فرماتی تھیں اور تمام گھر کی فضاؤں کو ہمہ نغمہ اور ہمہ موسیقی بنا دیتی تھیں، سوائے انکی "اور ہی نندیا" "اور ہی سوتیا میں تو پیہوں تورا ہی کانگنا" کے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور پھر اسکے ساتھ ساتھ طبلہ کی تھاپ سینی پر پڑتی تھی گٹکاریاں تو خیر اپنے نشیب فراز کے ساتھ باورچی خانہ یا زیادہ سے زیادہ گھر کی چہار دیواری کے اندر گونج کر رہجاتی تھیں لیکن جب وہ تان لگاتی تھیں تو تمام محلہ میں بارش نغمہ ہو جاتی تھی۔ ان کے اس عالم وجدان میں ہر ایک کو منہ مانگی مُراد ملتی تھی نہ کسی سے کوئی باز پرس ہوتی تھی نہ کسی پر غصہ نہ کوئی ان کے تیوروں سے ڈرتا تھا اور نہ کوئی برتاؤ سے رنجیدہ ہوتا تھا۔ بس اسوقت تو ان کا دل چاہتا تھا کہ جتنے گانے یاد ہیں سب آج ہی گا کر رکھدوں پھر خدا جانے زندگی رہے یا نہ رہے چنانچہ اُس جشن کے دن مختلف قسم کی ٹھمریاں دادرے، غزلیں، تھیٹر کی چیزیں، ہجڑوں کے گانے، گراموفون کے راگ، ایک آدھ مزاحیہ غزل، کچھ ڈومنیوں کی سمدھن کو دینے والی

منظوم گالیاں وغیرہ سننے میں آجاتی تھیں کبھی" گزر گیا ہو زمانہ گلے لگائے ہوئے" چھیڑ دیا تو کبھی "تری ذات پاک ہو الحذا تری شان جل جلالہٗ" شروع کردیا کبھی "ہمارا راجہ کو ڑیا کھول رس کی بوندان گریں" سے فضاؤں کو معمور کردیا تو کبھی "ہریالا بریلی والا دہ تو آگن ہیں لالے لگادے" سے کائنات کو مرقص کردیا کبھی "ہیارا ہالے ڈولے ہو" گانے لگیں تو کبھی بالوشاہی کی ٹکیاں ستیاں لایو رے" میں موسیقی کے کمالات دکھانا شروع کردیے غرضکہ اُس دن یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ تانسین کی قریبی عزیزہ ہیں اور یہ ہماری خوش قسمتی ہو کہ ایسی باکمال مغنیہ ہمارے گھر کی ماما ہو۔ اس دن وہ ہنستی بھی تھیں اور قہقہے بھی لگاتی تھیں لیکن کیا مجال ہو جو اُن کے گانے پر کوئی اعتراض کردے۔ حالانکہ ہمارا خیال ہو کہ ہمارے بڑے بوڑھے یعنی والد صاحب قبلہ اور ماموں صاحب مد ظلہ العالی اگر کسی اور کو گھر میں اسطرح گاتے ہوئے سُن لیتے تو شاید اُس کا دم ہی نکال لیتے لیکن گانیوالی تھیں بُوا جعفری خانم جو کم سے کم اتنا رعب رکھتی تھیں کہ سب اُن کا گانا سنتے تھے مگر کوئی دم نہ مار سکتا تھا اور اگر کوئی دخل دے بیٹھتا تھا تو بس اس کی شامت ہی آجاتی تھی حالانکہ یہ ہمت ذرا کم ہوتی تھی کہ کوئی بیٹھے بٹھائے یہ کمبختی مول لے اسلئے کہ سب جانتے تھے کہ اگر کہیں خدانخواستہ ان کی مزاجی حالت میں کوئی تغیر پیدا ہوا تو یہی بہشت جہنم بن جائے گا۔ اور

اس جہنم کے عذاب تمام گھر پر نازل ہوں گے۔ ان کے غیظ و غضب کا عالم
کوئی فراموش کرنے والی چیز نہ تھی اور ہر وقت سب ڈرتے ہی رہتے تھے کہ
کہیں ناک پر مکھی نہ بیٹھ جائے لیکن باوجود اس احتیاط کے غصّہ اپنے وقت پر
آتا تھا اور اس کا آنا برحق سمجھا گیا تھا۔ کچھ نہیں تو برسات کی گیلی لکڑیوں کو
سلگانے کی کوشش میں جب وہ حسب دلخواہ کامیاب نہ ہوتی تھیں اور تھوڑی
دیر تک پھکنی میں منہ لگا کر "پھوں پھوں" کرنے کے بعد بھی آنچ نہ نکلتی
تھی تو بس وہیں سے ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی تھیں اور ہم سب
آنیوالے طوفان کے منتظر ہو جاتے تھے کہ وہ پھر "پھوں پھوں" کرنیکے
بعد بھی بجائے آنچ کے چولھے سے دُھواں نکلتے دیکھکر بس ناچ ہی تو جاتی
تھیں اسوقت کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی چولھے میں مُنہ
ڈال کر پہلے تو لکڑیوں پر جوش میں آکر تھوکتی تھیں کہ:-
"تھو ہے تیری اوقات پر، اب کیوں جلے گی حرامزادی تو، خدا
غارت کرے اس موئے مولا بخش کو، اللہ کرے اسکی بھی ایسے ہی آنکھیں
پھوٹیں جیسی اس موئے نے میری آنکھیں پھوڑی ہیں جیسے ہم نے تو دام
دیے نہیں تھے بھیک مانگ لائے تھے اس موئے کے یہاں سے۔ اور
ہم سے کیا مطلب ہم تو نوکر چاکر ہیں، جسطرح بھی ہو یہ مصیبت جھیلیں گے۔
جب گھر کے مالکوں ہی کو پروا نہ ہوگی تو اس موئے کی جوتی کو کیا غرض

پڑی ہے جو سوکھی لکڑیاں دے آج ہی اگر یہ لکڑیاں اُس ہونڈی کاٹنے کے
منہ پر جاکے کوئی مار آئے تو پھر کبھی یہ پانی کی ڈوبی ہوئی لکڑیاں نہ آئیں گی
مگر وہ تو ضد مجھ کمبخت سے ہے کہ لے حرامزادی تو ہی مرا نہیں پھوڑ اور
کتے کا بھیجا بنا کر چولھا پھونکے جا، توبہ ہے بیوی میں نے ایسا بیڈھنگا
کارخانہ دُنیا جہان میں نہیں دیکھا اور مجھکو کیا خود ہی کھانے میں دیر ہو گی
میں کیا کوئی اپنی بوٹیاں کسی کو کھلا دوں گی یا اپنے ہاتھ پیر سُلگا کر ہانڈی
پکاؤں گی"

اور اس کے بعد پھر ان کے لئے ہر بات اشتعال انگیز اور ہر چیز
لڑائی کی جڑ بن جاتی تھی۔

"یہ موا گوشت آیا ہے جیسے کتے کا راتب ہو، حرام کے پیسے ہوتے
ہیں، بھر مٹھی دام لئے اور چھیچھڑے دیدیے جیسے دینے والے ویسے ہی اندھے
لانیوالے اور پھر ہانڈی خراب ہو جائے تو جعفری کی خطا، تو کیا
جعفری اپنا گوشت پکا دے۔"

"ابھی تک دہی کا پتہ نہیں ہے دہی لینے کیا گئے ہیں کہ جیسے
مر ہی رہے دہی بھی جیسے کوئی لندن میں ملتا ہے کہیں بیٹھے ہوں گے
ان کو کیا دیر ہو گی تو آئی گئی ہمارے سر جائے گی، ان کی جوتی کو
کیا غرض۔"

اور یہ مُرغیاں الگ ناک میں دم کئے ہوئے ہیں ان کمبختوں کا بھی
باورچی خانہ ہی میں ٹھکانا ہے۔ تمام دُنیا کی مرغیاں گھر کے باہر نکال دیجاتی ہیں
مگر ہمارے یہاں کی مرغیاں بھی نرالی ہیں کہ سر پہ موجود ہیں۔ بلی بھی ان کمبختوں کو
نہیں پوچھتی اب کوئی پوچھے کہ میں ہانڈی چولہا دیکھوں یا مُرغیوں کو
ہنکارتی رہوں؟

برتن الگ بھنک رہے ہیں سب کو تو بس یہ آتا ہے کہ ایک ایک برتن
نکالتے جاؤ اور ڈھیر کرتے جاؤ ان کو اس سے کیا جو کوئی دھوئے گا ہی گے
سر مصیبت رہے گی ہم برتن دھوتے دھوتے مرے جاتے ہیں اور یہاں کسی کو
پروا بھی نہیں ہے ابھی سویرے ہی سب برتن دُھلے تھے۔ اب پھر سب
ڈھیر ہیں۔ واہ۔

چُپ موئے تو نے اور بھی ٹیں ٹیں کرکے دماغ خالی کر رکھا ہے
نہ کلمہ نہ کلام بس ہر وقت ٹیں ٹیں آگ لگے تیرے ٹیں ٹیں کو جھلسا
پڑے۔

یہ ہمارے گھر کا "دسپنا" ہے موئے کی ٹانگیں چرچی ہوئیں نہ آگ
نکالتے بن پڑتی ہے نہ کچھ، ہاتھ الگ سے جلتے ہیں ہزار دفعہ کہا کہ ایک
"دسپنا" آجائے یا اسی کو ٹھیک کرا دیا جائے مگر وہ تو مجھ سے ضد ہے
جل چڑیل اور اپنے ہاتھوں کو جھلسا ہم سے نہیں ہوگا اس موئے سے کام

ببا اٹک بند ہوگیا پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے اب کیا میں اپنے سر سے ہاتھ دھوؤں، سویرے سے چیخ رہی تھی کہ ببا بند ہو جائے گا تھوڑا سا پانی بھر لیا جائے مگر میں تو جیسے کتیا تھی بھونکا کی اب ہم بھی بیٹھے رہیں گے اور آخر ہم کریں تو کیا کریں۔

مختصر یہ کہ جو چیز بھی ان کے سامنے آ گئی اُسکے متعلق ایک تبصرہ فرما دیا اور ہر ایک چیز کے اُس رُخ کو بحث میں لے آئیں جو یا تو واقعی قابلِ اعتراض ہوتا تھا ورنہ ان کے تبصرہ سے قابلِ اعتراض بنجاتا تھا بہرحال یہ وہ وقت ہوتا تھا کہ گھر کے بوڑھے جوان بچے مرد، عورت سب اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے رہتے تھے، مائیں اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیتی تھیں بچے اپنی ماؤں سے سہم کر لپٹ جاتے تھے۔ بیویاں اپنے شوہر کی حفاظت میں آجاتی تھیں اور شوہر سچے دل سے خدا کو یاد کرتے تھے۔ طوطا بولنا چھوڑ دیتا تھا کتا باہر بھاگ جاتا تھا سو نیوالے جاگ اُٹھتے تھے اور جاگنے والے بھاگنا چاہتے تھے لیکن اگر اس عالم میں کوئی بہادر اور شریر لڑکا اپنی جان پر کھیل کر بھوک سے بیتاب ہو کر باورچی خانہ میں جا کر کھانا مانگ بیٹھتا تھا گویا توپ کا دہانہ اُسی طرف پھیر دیا جاتا تھا۔

" تو کیا میں ہاتھوں میں مشین لگاؤں جو تم آ گئے ہاتھ پیر پھیلانے ہتھیلیوں پر سرسوں جمانے ہو بھیا۔ ابھی کوئی ایسی دیر بھی نہیں ہو گئی ہے

اور ہوگئی ہو تو میں کیا کروں اپنا سر چولھے میں تھوڑی دیدوں گی۔ ابھی تم کو کھانا کھائے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہو ہر وقت کھانا، ہر وقت کھانا کھانا نہوا آفت ہوگئی۔"

اولاد کے معاملہ میں ماں تو اندھی ہوتی ہو اُن صاحبزادے کی والدہ ماجدہ اپنی ممتا سے مجبور ہوکر بول اُٹھیں کہ:-

"وہ کونسا ہر وقت نگالا کرتا ہو جو تم اس طرح کہہ رہی ہو نہ کمبخت اسطرح مانگتا اور نہ یہ باتیں سنتا۔"

بس اسکے بعد سے باورچی خانہ میں ایک زلزلہ اور ایک طوفان اور ایک قیامت، ایک قیامت اور ایک قیامت بالائے قیامت کی کیفیات کے ساتھ ساتھ رونما ہوجاتی تھیں، بوا جعفری خانم ایک زخم خوردہ شیرنی کی طرح باورچی خانہ کی زمین کو آسمان سے اور آسمان کو زمین سے ٹکرا کر رکھدیتی تھیں۔ تھوڑی دیر تک تو ان کی مدمقابل یعنی کھانا مانگنے والے صاحبزادے کی والدہ مقابلہ کرتی رہتی تھیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ تھک کر اعتراف شکست کرلیتی تھیں، لیکن بوا جعفری خانم کا توپ خانہ برابر گولہ باری کرتا رہتا تھا وہ بڑبڑاتی تھیں، چیختی تھیں، پیٹتی تھیں، روتی تھیں اور آخر کار منہ پھلا کر اپنا پاندان لئے ہوئے اپنے پلنگ پر اٹوانی کھٹوانی لیکر پڑجاتی تھیں گویا انتجاجاً استعفیٰ دیدیا ہو اب ان کو باورچی خانہ سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا کھانا پکے

یا نہ پکے، کوئی کھانا کھائے یا نہ کھائے ہانڈی چولہے پا رہے۔ چوہے روٹیاں گھسیٹیں یا برتن کتا چاٹے ان تمام باتوں سے ان کو کوئی مطلب نہ ہوتا تھا اور باورچی خانہ بالکل سوراجی حکومت بن کر رہ جاتا تھا اور ایک طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوتا تھا لیکن بوا جعفری خانم کے ساتھ ہی والدہ صاحبہ بھی باورچی خانہ کا مقاطعہ کر دیتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آخر کار سب کو اس عظیم الشان ہستی اس جاہ و جلالت مآب وجود اس اہم ترین شخصیت اور اس بلند مرتبہ خاتون کے سامنے جھکنا ہی پڑتا تھا وہ روٹھی رہتی تھیں اور سب مناتے تھے وہ پھولی رہتی تھیں اور سب خوشامد کرتے تھے وہ قہر مجسم ہوتی تھیں اور سب بخشش چاہتے تھے کہ "اے خدا کی برگزیدہ بندی ہم تیرے حضور گناہگاروں کی حیثیت سے حاضر ہیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے اور ہم اپنی خطاؤں کیلئے معافی خواہ ہیں تو اگر چاہے تو ہم کو معاف کر سکتی ہے ورنہ شاید خدا بھی نہ معاف کرے۔"

لیکن وہ التجاؤں پر بھی اپنا منہ بدستور پھلائے رہتی تھیں اور والدہ صاحبہ کے تیور یہ ہوتے تھے کہ "اے میری محترم ملازمہ اگر کسی نے آنکھ دکھائی ہو تو آنکھ نکلوا دوں، کسی نے ہاتھ اٹھایا ہو تو ہاتھ کٹوا دوں اور کسی نے زبان درازی کی ہو تو گدی سے زبان کھنچوا دوں بہرحال تو خوش ہو جا کہ تیری خوشی میری خوشی ہے اور جو تجھ کو ناخوش کرے وہ میرا دشمن ہے

اور جو تجھکو ستاتا ہو وہ مجھکو ستاتا ہو"

ان صورتوں کے بعد بوا جعفری خانم دو چار دن میں رفتہ رفتہ ٹھیک ہو کر پھر اپنے "اسی" "زناٹے" پر آجاتی تھیں اور گھر بھر میں اُن ہی کا ڈنکا بجنے لگتا تھا۔

افسوس تو یہ ہو کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اس "جواںمرد خاتون" کو بھی نہ چھوڑا اور ان کے اُٹھتے ہی باورچی خانہ کی رونق بھی لُٹ گئی نہ وہ چہل پہل ہے نہ وہ شان و شوکت ہو بس اب صرف باورچی خانہ جہاں اب کھانا پکتا ہو اور جہاں سے صرف دُھواں برآمد ہوتا ہو بس اب ہم کو باورچی خانہ سے اتنا کام رہگیا ہو کہ دُور ہی سے پوچھ لیتے ہیں۔

پک گیا؟ تو پھر لاؤ۔

پکا چکیں؟ تو اب آؤ۔

وہاں گرمی ہو تو باہر آجاؤ۔

اسکے علاوہ تو اب یاد بھی نہیں آتا کہ یہی باورچی خانہ از منۂ قدیمہ میں کیا کیا رہ چکا ہو لیکن خدا نہ کرے کہ تاریخ اپنے واقعات کو دُہرائے۔

پچیسی

پکچر پیلس
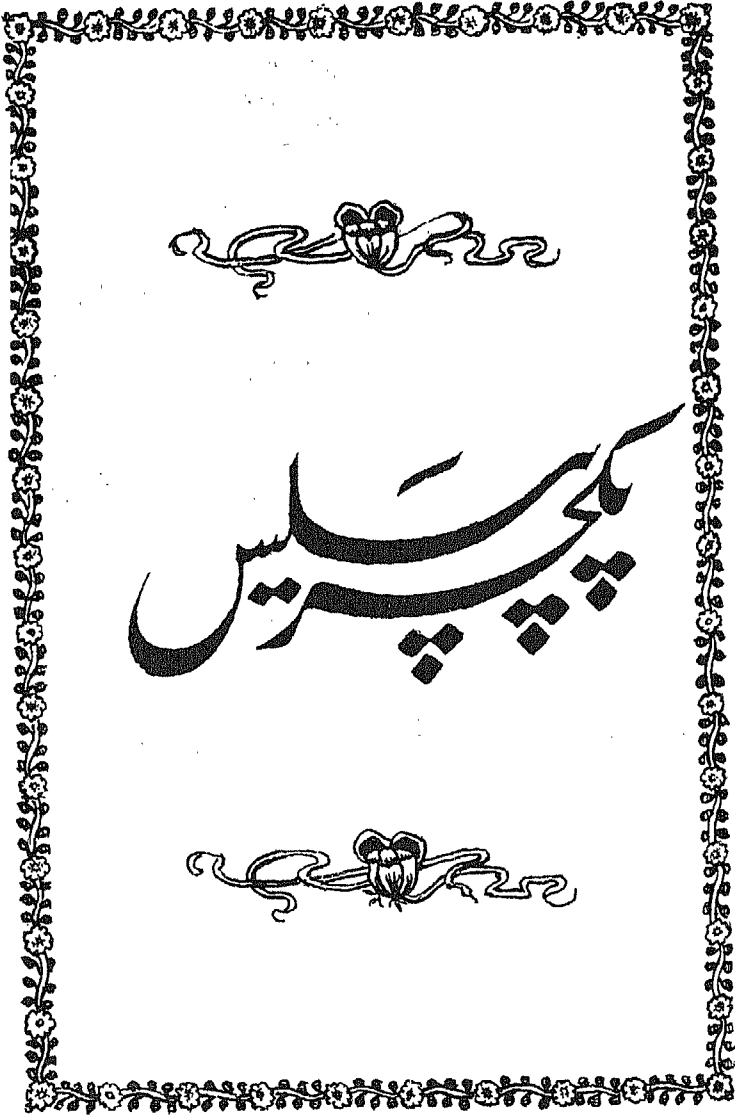
ہمارا شمار سینما کے معزز ناظرین میں اُسوقت سے ہے جب سینما محض آنکھوں سے دیکھا جاتا تھا اور کانوں کا وہاں کوئی کام نہ تھا بلکہ سینما کے معاملہ میں تو ہمارے کان ایسے مدفاضل میں پڑے رہتے تھے کہ جبتک ہم فلم دیکھتے تھے ہم کو ان کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی بلکہ چار آنہ والوں کے شور سے تنگ آکر بعض اوقات تو ہم بہروں پر رشک کرنے لگتے تھے۔ بہرحال چونکہ ہم سینما کے عشاق میں سے تھے اور اس کا تعلق براہِ راست آنکھوں سے تھا لہٰذا تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہم کو چشمے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ فلم بھی صاف دکھنے لگیں اور فلم دیکھنے کی وجہ سے بینائی میں جو فرق آگیا ہے وہ بھی دُور ہو جائے۔ ہمکو یہ کیا معلوم تھا کہ جن کانوں سے ہم اسقدر تغافل برت رہے ہیں وہی تھوڑے دنوں کے بعد سینما کے معاملہ میں آنکھوں کے برابر ضروری ہو جائیں گے اور دونوں میں سے ایک چیز کا بھی نہ ہونا سینما کے لطف سے محروم کر دیگا لیکن سائنس کی ترقیاں اور مغربی دماغ تو آئے دن ایسی ایجادیں فرماتے ہی رہتے ہیں جو ہمارے تصوّر سے بھی بالاتر ہوں۔ چنانچہ لکھنؤ میں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ فلم بھی آگئے جو سینما کو گونگے کا خواب نہیں رہنے دیتے بلکہ پرچھائیوں کو

گویائی بخشدیتے ہیں ہم کو بھی ان گویا فلموں کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا اور جس شام کو یہ فلم دکھایا جانیوالا تھا ہم نہایت ہی شوق اور اضطراب کے عالم میں پکچر پیلس پہونچگئے۔ جہاں ہمارے پہونچنے سے پہلے ہی بقول اخبار زمیندار انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ بہرحال اسی سمندر میں ایک حباب کی طرح ہم بھی شامل ہوگئے اور تھوڑی دیر کی "آگے بڑھو، پیچھے ہٹو" کے بعد بکنگ آفس کی ڈھابلی نما کھڑکی میں ہاتھ ڈال ہی دیا اسکے بعد ٹکٹ لینے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن ٹکٹ لیکر واپس آنا انسان کو فٹ بال بنا دیتا ہے۔ بہرحال پھر بھی یہی عالم گزرا اور جب ہم اُس مجمع سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ لیمپ کا بکسوا شیروانی کے دامن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور ٹوپی کا پھُندنا یہ تینوں ایک ایک عدد اسی مجمع میں رہ گئے ہیں لیکن اب ان کو ڈھونڈھنے کی کوشش کرنا گویا از سرِ نو خطرہ میں پڑنا تھا۔ لہذا ہم جان بچا کر ہال میں داخل ہوگئے اور ایک کرسی پر بیٹھکر اپنے حواس ٹھیک کرنے لگے۔ ہال کے اندر ہمارے آنے سے پہلے ہی تقریباً تمام مردم شماری میں شریک ہونیوالے جمع ہوچکے تھے لیکن ہمارے پہونچنے کے بعد بھی ہال کے ہر دروازے سے انسانوں کی پیداوار جاری تھی۔ یہاں تک کہ جب ہال کی تمام کرسیاں چار آنے کے درجے سے لیکر تین روپے کے درجے تک بھر گئیں تو ایک ایک کرسی پر دو دو نے بیٹھنا شروع کردیا لیکن یہ سلسلہ بہت ہی جلد

ختم ہوگیا غالباً ٹکٹ بند کر دیے گئے ہوں گے ورنہ ہمارا تو خیال تھا کہ تمام
لکھنؤ نے آج ہی تماشا دیکھنے کی قسم کھالی ہو۔

اب ہال کے تمام دروازے بند تھے اور تمام ہال بھانت بھانت کے پرندوں
چرندوں اور درندوں کے چہچہوں، دھاڑوں اور آوازوں سے گونجا ہوا
تھا اور مجموعی طور پر جو آواز ہمارے کانوں میں آرہی تھی کسی ایسی لشکری زبان کی
آواز تھی جو اردو تو اردو ہو پشتو سے بھی زیادہ فصیح معلوم ہوتی تھی حالانکہ ہم
اس آواز کو سننے کی کوشش نہیں کر رہے تھے لیکن یہ آواز خود ہمارے
کانوں کے پردوں کو پھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی، ہم کب تک کانوں میں
انگلیاں دیے بیٹھے رہتے جہاں کان کھلے اور "شرغوں غش شوں شق شقاق
ہاہاہا ٹر بڑ شق شر رچخ پخ لغ تغوں غوں غوں غٹاک" اور نہ معلوم
کیا کیا آوازیں کانوں کے پردے سے ہوتی ہوئی دماغ کو لیکر اڑ جاتی
تھیں اور تالیاں معہ سیٹیوں کے گویا گھاتے میں تھیں خیر اس تمام کیفیت
کے تو ہم عادی تھے اسلئے کہ عمر گزر چکی تھی سینما دیکھتے اور اس لشکری زبان کو
سنتے سنتے لیکن جب فلم شروع ہوا اور ہر طرف سے "خاموش خاموش" کی
سکوت شکن آوازوں نے اسٹیج میں گونجنا شروع کیا تو ہم سمجھے کہ شاید اب
یہ غل کم ہو جائے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا کہ سب خاموش ہو گئے البتہ
کھانسی کے مرض میں مبتلا یا دمے کے مریض یا چھینکنے والے تو خیر مجبور ہی تھے

بہرحال کم سے کم اتنی خاموشی تو ضرور ہوگئی کہ ہم فلم دیکھنے کے ساتھ سن بھی سکیں۔

یہ ایک ہندوستانی فلم تھا جسکی زبان بھی اردو تھی یعنی چار آنے والے بھی بخوبی سمجھ سکتے تھے بشرطیکہ خاموش بیٹھکر سنتے لیکن چار آنے والوں کا خاموش رہنا بالکل اسی طرح ناممکن ہے جسطرح کتے کا بھونکنا چھوڑ دینا یا گدھے کا سینگوں سے توبہ کر لینا وہ اپنی غل غش سے بھلا کاہے کو باز آتے لیکن ہم بھی اس طرح بیٹھے ہوئے سن رہے تھے گویا فلم کی آواز اس تمام شور و غل کے باوجود سیدھی ہمارے کانوں میں آرہی تھی۔ تماشا ہورہا تھا اور ہم ہر طرف سے خالی الذہن فلم کے اندر گویا کھوئے ہوئے تھے۔

فرہاد نے جب شیریں کے حسب منشا دودھ کی نہر تیار کر لی اور شیریں نے خود اسکو دیکھکر فرہاد سے پوچھا کہ بتا کیا مانگتا ہے تو اس نے نہایت بے تکلفی سے کہدیا:- "تمھیں سے تمھیں کو لربا مانگتا ہوں"

اس مصرعہ کو سمجھنے والے سامعین چار آنے والوں سے زیادہ سخن سنج اور کون ہو سکتے تھے وہ داد دی ہے کہ اسٹیج اڑ گیا اور ہم سوائے دس منٹ "ہاہاہاؤں، بھاؤں، ہشی نسر، شرر، رر، رر" وغیرہ کے اور کچھ نہ سن سکے شیریں کے بھی لب جنباں تھے اور فرہاد کا بھی منہ چل رہا تھا لیکن وہ کیا کہہ رہے تھے اس کا ہم کو کچھ علم نہیں۔ ان دونوں کی باتوں کا ہم کو کیا

علم ہو سکتا تھا جبکہ اس غل میں ہماری بہت زوردار "آرڈر پلیز" اور "خاموش" بھی خود ہم ہی کو نہیں سنائی دیتی تھی۔ خدا جانے اتنی دیر میں کیا کیا ہوتا رہا کہ ذرا جو غل کم ہوا تو فرہاد صاحب کی تان سنائی وہی :-

"میں تو شیریں کا ہوں دیوانہ ------ ہاں ------

------ "میں تو شیریں کا ہوں دیوانہ"

مگر یہ چونی والوں کی شان کے خلاف تھا کہ وہ ہم کو یہ بھی سننے دیتے اس گانے کو بھی اپنی "جی جاؤں غرغر فش بھاخ شوں شر" میں لے اڑے اور ہم دانت پیس کر یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ "آرڈر پلیز" "خاموش" کر کے رہ گئے تماشا ہوتا رہا اور چونی والے بھی گویا ہماری ضد پر ہلڑ مچاتے رہے کچھ نہ پوچھئے کہ ہمارے ارمانوں کا کس طرح خون ہو رہا تھا اور ہمارے خون میں کس قدر جوش تھا دل چاہتا تھا کہ ان سب چیخنے والوں کے حلق میں بانس ٹھونس دیا جائے، یا ان سب کو پہلے ٹھنڈا کر دیا جائے اس کے بعد اطمینان سے تماشا دیکھا جائے یعنی ملاحظہ تو فرمائیے کہ یہ کمبخت ہمارے ٹکٹ کے داموں کو ضائع کر رہے تھے۔ ہمارے ارمانوں کا خون کر رہے تھے۔ ہماری دلچسپی کو مٹی میں ملا رہے تھے ہم کو مشتعل کر کے مارے غصہ کے نچا رہے تھے اور خود نہایت اطمینان سے قہقہوں پر قہقہے ٹھٹوں پر ٹھٹے اڑا رہے تھے گویا کوئی بات ہی نہیں ہر سچ بتائیے کہ اگر اسوقت ہم کو تھوڑی دیر کیلئے مارشل لا کے اختیارات

دیدیے جاتے تو ہم کیا کرتے خیر اور تو کچھ نہیں لیکن چار آنے والے درجے کو
قبرستان نہ بنا دیتے تو ہمارا نام بدل دیا جاتا مگر کیا کرتے مجبور تھے ہم کان صاف
کر کر کے سننے کی کوشش کر رہے تھے اور چونی والے گلا پھاڑ پھاڑ کر
چیخ رہے تھے اسکا نتیجہ ظاہر ہے کہ فلم تو خیر سن ہی نہیں سکتے تھے لیکن خون
البتہ کھول رہا تھا آخر کار یہ ہوا کہ فرہاد سے کسی نے کوئی بات کہی خدا جانے
کیا اس کو اللہ جانے اور چونی والے لیکن ہوا یہ کہ فرہاد گرا اور
مرگیا اسپر بھی چونی والوں نے اپنی مشترکہ زبان کا قومی نعرہ لگایا اور ہم غصہ
میں اپنی بوٹیاں نوچتے ہوئے ہال سے باہر نکل آئے اور قسم کھالی کہ جبتک
چونی والا درجہ نہ ٹوٹے گا ہم کبھی ٹاکی فلم دیکھنے نہ آئیں گے۔

برق
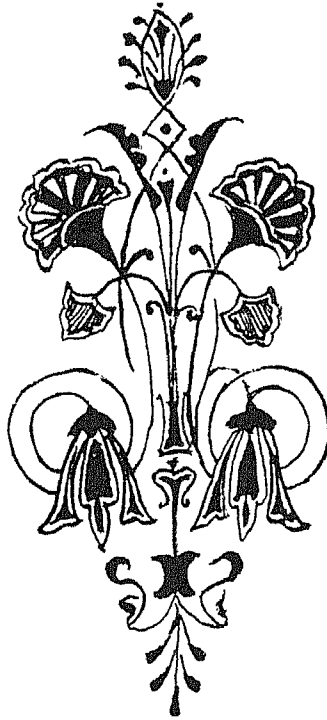
برقعہ

برقعہ جسکو مستورات کا غلاف یا "عورت پوش" کہنا زیادہ مناسب ہوگا اگر کوئی لباس ہو تو واللہ عجیب غریب قسم کا لباس ہے اور وہ صرف خود ہی عجیب غریب نہیں ہو بلکہ جو کوئی استعمال کرے وہ بھی عجیب غریب ہو کر رہجاتا ہو۔ یہ اور بات ہو کہ ہم اور آپ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ابتک برقعہ دیکھتے دیکھتے برقعہ دیکھنے اور برقعہ دیکھکر اسکو عجیب غریب نہ سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں ورنہ یہ واقعہ ہو کہ اگر کوئی ایسا شخص جو اس برقعہ پوش ملک کا باشندہ نہ ہو اور جس نے کبھی برقعہ نہ دیکھا ہو۔ ہندوستان آکر راستہ گلی میں کسی برقعہ پوش کو دیکھ لے تو جہاں پر ہوگا وہیں پر رہجائے گا اسکی نظریں برقعہ پوش پر جم جائیں گی اور وہ غور کرنے لگے گا کہ آخر یہ ہو کیا! بہت ممکن ہو کہ وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ کسی مسخرے نے گاؤ تکیہ کا غلاف اوڑھ لیا ہو یا وہ یہ سمجھے کہ یہ بچوں کو ڈرانے والا "ہوّا" ہے۔ یا اسکی سمجھ میں یہ آئے کہ ہندوستان میں انسان بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ بذریعۂ پارسل بھیجے جاتے ہیں اور یہ اسی قسم کے پارسلوں میں کا ایک پارسل ہو۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہو کہ اگر اندھیری رات میں کسی سنسان مقام پر اسی قسم کے کسی اجنبی کو کوئی برقعہ پوش ملجائے تو وہ سوائے اسکے کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی مردہ

مع کفن کے قبر سے نکل بھاگا ہو اور یہ سمجھکر اس بیچارے کا جو کچھ حال ہو سکتا ہے
وہ ظاہر ہے بہر حال چاہے وہ برقعہ پوش کو کفن پوش سمجھے یا از قسم بھوت
پریت اور آسیب وغیرہ کچھ سمجھے۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ وہ یا تو سر پہ پیر رکھکر
بھاگے گا یا بیہوش ہوکر گر پڑے گا یا چیخنا شروع کردے گا اسکی یہ حرکتیں
ہمارے اور آپکے نزدیک مضحکہ خیز ضرور ہونگی۔ لیکن آپ خود غور فرمائیے کہ وہ
بیچارہ اگر پہلی مرتبہ برقعہ کو دیکھکر اس طرح بدحواس ہوجائے تو اسمیں اسکی
کیا غلطی ہوگی جبکہ برقعہ واقعی ایسا ہی خوفناک ہوتا ہے اور اس کو پہننے کے
بعد عورتیں نہ صرف اپنا چہرہ چھپاتی ہیں۔ بلکہ اُن پر انسان ہونے کا شبہ
بھی بہ مشکل کیا جا سکتا ہے۔

برقعہ کا مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ وہ عورتیں جن سے دنیائے مستورہ
آباد ہے اگر کبھی منظر عام پر آئیں تو غیر مردوں کی نگاہیں ان کو نہ دیکھ سکیں بلکہ
اُس لباس سے ٹکرا کر رہجائیں جسکو بُرقعہ کہتے ہیں۔ لیکن ان کو اس کی
کیا خبر ہے کہ برقعہ پہن کر وہ مردوں کی نگاہوں سے چھپنے کے بجائے
اچھی خاصی تماشا ہوجاتی ہیں اور تماشا بھی ایسا جسکو دیکھنے کا خواہ مخواہ
اشتیاق پیدا ہو گویا ان کی حیثیت اُس تماشے کی سی ہوتی ہے جو تھیٹر کے
ڈراپ سین میں نظروں سے پنہاں رہتا ہے اور ان کا برقعہ تھیٹر کا پردہ ہوتا ہے
جسکے اُٹھا جانے کے لئے تھیٹر کے معزز ناظرین وقت سے قبل ہی مارے

اشتیاق کے خدا جانے کتنی سٹیاں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ عورتیں تو
برقعہ پہن کر اس طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتی ہیں کہ اب ان کو کوئی
نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن ان کو اسکی خبر نہیں ہوتی کہ دیکھنے والے ان کا
برقعہ دیکھکر ان کو خدا جانے کس کس شکل و صورت میں دیکھ لیتے ہیں،
خود ان کا برقعہ ہر شخص کی نظروں کے سامنے برقعہ والی کی ایک ایسی
خیالی تصویر پیش کر دیتا ہے جسپر کامل یقین ہو جاتا ہے اور وہ اُس خیالی
تصویر کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہی تصویر اس برقعہ میں نہاں ہے
فرض کر لیجئے کہ کوئی بڑھی بی برقعہ پہن کر کسی عام راستہ سے گزریں
تو راہگیر ان کو کبھی بڑھی بی نہ سمجھیں گے۔ بلکہ اُن کے ذہن میں ہمیشہ یہی
خیال ہوگا کہ اس میں کوئی جوان عورت ہوگی جو خوبصورت بھی ضرور
ہوگی۔ چنانچہ نہیں معلوم کتنے راہگیروں کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ان
برقعہ پوش بڑھی بی پر جم جائیں گی کہ کبھی طرح برقعہ کی نقاب کو جنبش ہو
اور وہ صرف ایک ہی مرتبہ اس برقعہ پوش کو دیکھ لیں۔ حالانکہ اگر وہ
بڑھی بی بغیر برقعہ کے باہر نکلتیں تو کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔
بلکہ اگر کسی کی نظر خواہ مخواہ ان پر پڑ بھی جاتی تو وہ منہ پھیر لیتا۔
اس قسم کے مناظر روزانہ ریلوے اسٹیشنوں پر دیکھنے میں آتے
ہیں کہ برقعہ پوش خواتین سفر کرتی ہیں اور مسافران کی تاک میں

لگے رہتے ہیں کہ ان کی صورت کیسی ہو؟ مسافروں کا یہ تجسس کچھ فطری سا ہوکر رہ گیا ہو۔ بات یہ ہے کہ برقعہ خود ایک سوالیہ نشان ہو اور اسکے معنی بھی یہی ہیں کہ "بتاؤ تو سہی ہماری صورت کیسی ہو؟" آپنے دیکھا ہوگا کہ بے پردہ خواتین بھی سفر کرتی ہیں اور مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سفر کرتی ہیں لیکن ان کی طرف متوجہ ہونا لازمی بات نہیں ہو۔ اس لئے کہ وہ تو بے پردہ ہوتی ہیں۔ ان کی طرف سے اطمینان ہوتا ہو کہ جب دل چاہیگا دیکھ لیں گے۔ لیکن برقعہ دیکھا اور یہ شوق خود بخود پیدا ہوا کہ اس میں کیا ہو اسکو دیکھنا چاہیئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ شوق کسی بدنیتی کے ساتھ پیدا ہوتا ہو یا جو لوگ برقعہ دیکھکر برقعہ والی کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ سب ایک سرے سے بدمعاش بھی ہوتے ہیں بلکہ وہ بیچارے چاہے کتنے ہی شریف اور نجیب الطرفین کیوں نہوں لیکن برقعہ دیکھکر ان کو خود بخود یہ محسوس ہونے لگتا ہو کہ ہم کو برقعہ پہن کر چیلنج دیا گیا ہو کہ "ہم کو دیکھ لو تو ہم جانیں"۔ اب ان بیچاروں کا یہ حال ہوتا ہو کہ مارے شرافت کے آزادی کے ساتھ تو برقعہ کی طرف نگاہیں اُٹھا نہیں سکتے اسلئے کہ یہ بھی شرافت سے بعید ہو البتہ وہ یہ ضرور کرتے ہیں کہ کنکھیوں سے یا نظریں بچاکر برقعہ دیکھ ضرور لیتے ہیں اور اگر وہ اسکی بھی کوشش کریں کہ برقعہ کی طرف نظریں نہ اُٹھائیں تو بھی نظریں اُٹھ ہی جاتی ہیں اور خواہ کتنی ہی سادگی سے اُٹھیں۔ لیکن اس طرح اُٹھتی ہیں گویا وہ اتنی مجرمانہ طور پہ

اُٹھ رہی ہیں. حالانکہ اگر ایک مرتبہ بھی برقعہ والی ہمت سے کام لے کر برقعہ کی نقاب اُلٹ دے تو پھر تمام دیکھنے والوں کو اطمینان ہو جائے اور وہ اس طرح مطمئن ہو جائیں گویا ایک بہت ہی اہم سوال خود بخود حل گیا بلکہ ایک بار اُن کے سر سے اُتر گیا اسکے بعد سے وہ برقعہ والی ان کی ماں بہن کے برابر ہوتی ہو۔

اب یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہو کہ کیا نقاب اُٹھانے سے پہلے وہ برقعہ والی دیکھنے والوں کی ماں بہن سے کچھ کم ہوتی ہو اور کیا ہر دیکھنے والا بُری ہی نظر سے دیکھتا ہو تو اسکا جواب یہ ہے کہ جن نگاہوں سے برقعہ والی کو دیکھا جاتا ہو ان کے متعلق قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پاک ہیں یا مجرمانہ اسلئے کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ پاک سے پاک نگاہ بھی برقعہ پوش پر مجرمانہ نگاہوں کی طرح پڑتی ہو اور یہ معلوم ہوتا ہو کہ دیکھنے والا خود یہ سمجھ رہا ہو کہ میں بُری بات کر رہا ہوں. لیکن برقعہ کچھ اس کو دیکھنے پر مجبور ہی کر دیتا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے نظر کمبخت پڑ ہی جاتی ہو. عورتیں شاید یہ سمجھتی ہونگی مرد سب ایک سرے سے شہدے اور بدمعاش ہوتے ہیں کہ جہاں کوئی شریف زادی برقعہ پہن کر نکلی اور تمام مردوں نے تاک جھانک شروع کی۔ عورتوں کا یہ خیال غلط ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مرد ان کو نہیں بلکہ برقعہ کو جاذب نظر چیز سمجھتے ہیں اور برقعہ خود بخود ان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہو اس کا ثبوت یہ ہو کہ اگر آپ کسی مرد کو برقعہ پہنا کر باہر نکالدیں تو اسکو بھی دیکھنے والے ان ہی نگاہوں سے دیکھیں گے اور

ان کو یہ شوق ہوگا کہ اس برقعہ والے معمہ کو حل کریں۔

بات کہاں سے کہاں پہونچگئی بیان کر رہے تھے ہم برقعہ کے متعلق اور قصہ چھیڑ دیا مردوں کی معصومیت کا، ہاں تو برقعہ کی بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں قسمیں ہوتی ہیں ایک قسم جو سب سے زیادہ عام ہو وہ تو فقیرنیوں والا برقعہ ہے جو کثرت استعمال سے کوئی ایسا پختہ رنگ اختیار کر لیتا ہو جسکو علاوہ اُس برقعہ کے کسی اور کپڑے پر نہیں لایا جا سکتا اسلئے کہ وہ رنگ بازاروں میں نہیں ملتا کہ اُسکی پڑیا لے کر گھول دی جائے اور کپڑا رنگ لیا جائے اسکے علاوہ وہ برقعہ خواہ کسی کپڑے کا ہو لیکن معلوم ہوتا ہو کہ موم جامہ کا بنا ہوا ہو اگر اس برقعہ کو برساتی کی جگہ استعمال کیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ وہ برساتی سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اس پر پانی کبھی ٹھر ہی نہیں سکتا۔ اس برقعہ میں جا بجا پیوند بھی ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو اس کثرت سے پیوند ہوتے ہیں کہ یہ سمجھنا نا ممکن ہو جاتا ہو کہ برقعہ کا اصلی کپڑا کونسا ہو اور پیوند کون سے ہیں، یہ برقعہ ان غریب فقیرنیوں کے لئے ایک قسم کا روزی کا ٹھیکرا ہوتا ہو اور اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہو کہ لوگ پردہ نشین پر رحم کھائیں اسکے متعلق یہ سوچیں کہ غریب پر خدا جانے کیسا وقت پڑا ہے کہ اپنے گھر سے نکل کر ہمارے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہے لہذا اسکی مدد کرنا ہمارا فرض ہو اور یہی سب سے زیادہ خیرات کی مستحق ہو۔ آپ ہی بتائیے کہ اگر اس نے برقعہ نہ پہنا ہوتا تو آپ کیا اُسکو اسی قدر مستحق سمجھتے جسقدر بے پردہ فقیرنیوں کو

سمجھتے ہیں۔

ایک برقعہ وہ ہوتا ہے جس کو پہن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہننے والی بیچاری کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ کفن پہن کر بجائے اسکے کہ چار آدمیوں کے کندھوں پر جائے بجائے خود بہ نفس نفیس قبرستان جا رہی ہے اور وہاں جا کر بجنسہ قبر میں لیٹ جائیگی یہ برقعہ بالکل سفید ہوتا ہے اور اسکو سر پر منڈھ کر بالکل کفن کی طرح پہن لیا جاتا ہے۔ یہ برقعہ بھی راستوں میں عام طور پر نظر آتا ہے کبھی اکسٹھ باسٹھ کے انداز سے جوتیاں چٹخارتا ہوا پیدل اور کبھی کسی یکہ یا تانگہ پر بستر کی طرح رکھا ہوا اس برقعہ میں حسب ضرورت ترمیمیں کی جاتی ہیں مثلاً سر پر جھالر لگالی اور بالکل گاؤ تکیہ کا غلاف بنا لیا یا آنکھوں کی جالی کو کروشیا میں سے خوبصورت بنا کر اپنی دست کاری کے کمال دکھا دیے یا ادھر ادھر یا چاروں طرف لیس سی کر اپنی خوش سلیقگی کی نمائش کر دی۔ بہرحال برقعہ کی ساخت وہی ہوتی ہے جسکو غلاف یا کفن سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی قسم کے سفید برقعوں کو طرح طرح سے بنایا جاتا ہے مثلاً ایک تو ٹخنوں تک کا گون بنا لیا۔ جیسا عام طور پر اسپتالوں میں کمپاؤنڈر یا آپریشن کرتے وقت ڈاکٹر پہنا کرتے ہیں اور اس کے بعد سر سے لے کر کمر تک دوسرا ٹکڑا بنا لیا۔ بہرحال دونوں مل کر وہی ہو جاتے ہیں جو بغیر اس طوالت کے تھے۔

ایک برقعہ ایسا ہوتا ہے گویا ابھی دلہن نے اپنے گون کو سر سے

پہن لیا ہے یا کسی ایل۔ایل ڈی نے اپنے گون اور جبہ کو رٹوپی میں نقاب کا بھی اضافہ کردیا ہے۔ اب آجکل تو برقعوں کا یہ فیشن ہے کہ چٹائی کی ہیٹ پر کپڑا منڈھکر ایک نقاب لگادی اور اس ہیٹ کے چاروں طرف کمر تک کو چھپا سکنے والا کپڑا سی دیا اسکے بعد شانوں تک کا ایک گون سی لیا یا صرف جیٹر نما کوٹ بنالیا اور دونوں کو ملاکر برقعہ بنا لیا اس قسم کے برقعوں کو پہن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لیٹر بکس چلا جارہا ہے۔ مختصر یہ کہ کہاں تک برقعہ کے جملہ اقسام گنائے جائیں۔ یوں تو ایک برقعہ وہ بھی ہے جو ملکہ ثریا نے بمبئی میں پہنا تھا اور ایک برقعہ بھی ہوتا ہے جو ساری پہننے والیاں استعمال کرتی ہیں یعنی ساری باندھ لی اور اُس کے اوپر اسی رنگ کا ایک سر سے لیکر کمر تک غلاف سی لیا۔ لیجئے برقعہ تیار۔

لیکن ان برقعوں کے سلسلے میں جو جو تکلفات اور اہتمام برتے جاتے ہیں وہ ضرور بیان کئے جائیں گے اس لئے کہ ہم تو برقعہ کا مقصد یہی سمجھتے ہیں کہ عورتیں غیر مردوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ سکیں۔ لیکن وہ برقعہ ایسا بناتی ہیں کہ خواہ مخواہ اُسپر نظریں پڑیں اور برقعہ والی کی خوش سلیقگی دستکاری، نفاست، خوش مذاقی اور کاریگری کی داد دیں یعنی وہ اپنے برقعہ کو طرح طرح سے جاذب نظر بناتی ہیں۔ کہیں تو خوبصورت بیلیں سی جاتی ہیں کہیں پر نفیس جھالریں لگائی جاتی ہیں۔ کہیں ریشمی ڈوریاں لگائی جاتی ہیں اور کہیں کردشیا وغیرہ کے کمالات صرف کئے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ برقعہ

بجائے خود ایک حسین چیز بن کر اپنے اصلی مقصد کو فوت کر دیتا ہے اور اچھی خاصی نمائش بن جاتا ہے اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ اگر مرد دیکھیں تو ان کا قصور۔

یہ سب کچھ سہی لیکن برقعہ کی سب سے زیادہ دلچسپ قسم وہ ہوتی ہے جو برقعہ پہننے والیاں نقاب اُلٹ کر سر پر رکھ لیتی ہیں اور پھر بھی اپنے کو برقعہ پوش سمجھی ہوئی بازاروں میں پھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یعنی اس برقعہ کی مصیبت کو بھی برداشت کیا خواہ مخواہ یہ لبادہ بھی لادا اور پھر کچھ نہیں۔ جس چہرہ کے چھپانے کے لئے سب کچھ کیا گیا تھا وہ بدستور بے نقاب رہتا ہے۔ کوئی ان برقعہ والیوں سے پوچھے کہ نیک بختو تم سے کس نے کہا تھا کہ برقعہ پہنو اگر تم اپنا چہرہ اسی طرح کھلا ہوا رکھ سکتی ہو تو پھر اس عذاب میں کیوں مبتلا ہو اسکے معنی تو یہ ہوئے کہ برقعہ بھی پہنیں گے اور بے پردہ بھی رہیں گے۔ ذرا یہ زبردستی تو دیکھئے اور یہ ضد تو ملاحظہ فرمائیے۔

ان تمام باتوں سے کہیں آپ یہ نتیجہ نہ نکالئے گا کہ یہ خاکسار برقعہ کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے یا اس کی گھر والی کے پاس برقعہ نہیں ہے۔ جی نہیں اس خاکسار کی اندرون خانہ کے پاس بھی بفضلہ ایک سیاہ رنگ کا برقعہ موجود ہے۔ وہی دو ٹکڑوں والا سر سے لیکر کمر تک کا ایک ٹکڑا اور شانوں سے لیکر ٹخنوں تک کا دوسرا ٹکڑا اور جب وہ اللہ کی بندی ان دونوں ٹکڑوں کو ملا کر پہنتی ہے تو

تو بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کھینچنے کے لئے کیمرہ بالکل تیار ہے۔ ان سے لاکھ لاکھ کہا کہ دیکھو جی اس حرکت سے باز آؤ تم کو اس قطع میں دیکھ کر معصوم بچے دہل جائیں گے لیکن جناب وہاں اس کا کوئی اثر نہیں ہے جب کہیں گھر سے باہر جانے کا اتفاق ہوا وہ سر سے پیر تک "کالی کلکتہ والی" بن جاتی ہیں۔

اب بتائیے کہ ہماری یہ تمام بکواس بیکار نہیں تو اور کیا ہے۔ جب حال یہ ہے کہ چراغ کے نیچے خود ہی اندھیرا ہے اور اندھیرا بھی سیاہ برقعہ والا۔ الامان والحفیظ۔
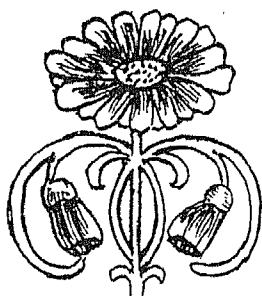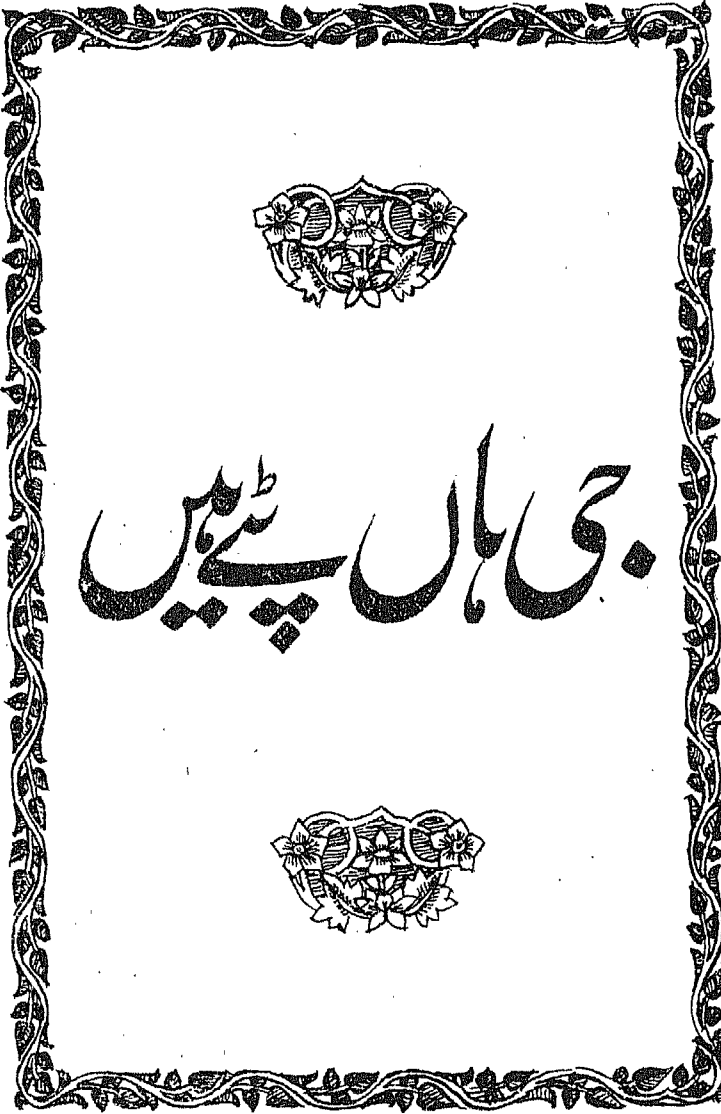
جی ہاں پٹے ہیں

جی ہاں پٹے ہیں

عاشقی میں تو خیر عزت سادات تک چلی جاتی ہو اور اس طرح کہ گویا بات ہی نہیں۔ لیکن اب معلوم یہ ہوتا ہو کہ مزاح نگاری میں بھی ناک کا جڑ سے صاف ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ رہے گی اور واقعی جب خود مزاح نگار اپنی برادری کی عزت و آبرو کے درپے ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ مزاح نگاروں کی آبرو ریزی ہوتے ہوئے کیا دیر لگے گی، چنانچہ ملاحظہ فرمائیے کہ خود مزاح نگاروں کی برادری کے ایک رکن برادرم مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی المتخلص بہ گول تار کو جو مار وار میں بیٹھے بٹھائے دل لگی سوجھی تو کلکتہ کے ظریف اخبار عجوبہ پنچ میں یہ تجویز پیش فرمادی کہ ہندوستان کے تمام مزاح نگار خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس سوال کا جواب بصورت مضمون دیں کہ کیا "وہ کبھی پٹے ہیں"؟ اور پھر لطف یہ کہ جواب میں بچپن یا طالب علمی کے زمانہ کی پٹائی سے کوئی بحث نہ کیجائی بلکہ وہ پٹائی جو بچپن اور طالبعلمی کے بعد یعنی باعزت اور باحیثیت ہو کر اپنی حماقت یا دوسروں کی زیادتی کی بدولت ہوئی ہو۔ اب بتائیے کہ یہ بات تمام عزت و آبرو پر پانی پھیر دینے والی ہو یا نہیں؟ اگر ہم جھوٹ بول کر بچنا بھی چاہیں کہ بھائی یہ اتفاق کبھی ہم کو پیش نہیں آیا تو اسکے واسطے بھی اس ظالم چغتائی نے بندش بندی کردی ہو کہ اگر ان حضرات میں سے

کسی صاحب نے اسوجہ سے انکار کر دیا کہ میں کبھی نہیں پٹا تو بخدا مجھے تو یقین آنے لگا نہیں ایسی صورت میں سوائے صاف صاف عرض کر دینے کے اور کیا چارہ ہو؟

الوداع لے عزت و آبرو، الفراق لے خاندان بھر کی ناک۔ اگر آپ ایمان کی بات پوچھتے ہیں تو جی ہاں پٹے ہیں اور ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ بارہا پٹے ہیں مگر اس طرح کہ ہم نے بھی پیٹا ہے اور اس پیٹنے کے جواب میں۔ ع

"کیا خوب سودا نقد ہو اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے"

خود بھی مار کھائی ہو اور ہماری بھی مرمت ہوئی ہے لیکن چونکہ اس مضمون میں ہم کو اس کا پابند بنایا گیا ہو کہ ہم محض اپنے پٹنے کی داستانیں بلکہ نوحے عرض کر دیں۔ لہذا اپنی شجاعت کے افسانوں کا موقع نہیں ہو تاہم اس مضمون کے پڑھنے والوں کو اپنی اپنی جگہ پر یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلے میں جب لکھنؤ کی فضائیں "گو بیک سائمن سائمن گو بیک" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھیں اور سیاہ جھنڈیوں سے کمیشن کا استقبال کرنے والوں کے علاوہ بہت سے تماشائیوں کا بھی چارباغ اسٹیشن کے قریب میلہ لگا ہوا تھا۔ ہم کو بھی روزنامہ ہمدم مرحوم کے دفتر سے اُٹھا کر اس محشرستان میں بھیجدیا گیا کہ تمام واقعات کی عینی شہادت حاصل کریں

اور ہم دفتر سے اُٹھ کر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس "انسانوں کے ٹھاٹھیں
مارتے ہوئے سمندر" میں ایک قطرہ کی طرح شامل ہو گئے۔ سیاہ جھنڈیوں سے
فضائیں تاریک ہو رہی تھیں اور "گو بیک" کے نعروں سے زمین اور آسمان
ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف تو مجمع کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف پولیس کے
لال پگڑی والے پیدل اور سوار مجمع کو آگے بڑھنے کی کوشش سے روکنے
بلکہ پیچھے ہٹانے کی جدوجہد میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ بہرحال اسی متواج سمندر
میں ہم بھی تھپیڑے کھا رہے تھے کہ ایک دم سے خدا جانے کمیشن آ گیا یا قیامت
آ گئی لیکن ایک کھلبلی سی مچ گئی پولیس والے مجمع پر جھپٹے اور مجمع سے بہت سے
لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے اس طوفان کی وجہ دریافت کرنے کا کسے ہوش تھا
ہم بھی بلا وجہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے مگر بھاگتے کدھر ہر طرف تو انسان ہی انسان
تھے جو بھاگنے تک کی جگہ نہ دیتے تھے۔ بہرحال کسی پر گرے کسی کو اپنے اوپر
گرایا اور کسی نہ کسی طرح مجمع سے نکل جانے کی کوشش کرنے لگے اور ایک حد تک
بد حواسی کے ساتھ کوشش کرنے لگے لیکن اُدھر سے پنڈت جواہر لال نہرو
ڈٹے رہنے پر زور دے رہے تھے اور بہت سے بھاگنے والے اس نازک
وقت میں بھی ان کی آواز سننے کا ہوش رکھتے تھے لیکن ہم نے تو طے
کر لیا تھا کہ کوئی بھی کچھ کہے مگر بندہ اب یہاں ٹکنے والا نہیں ہے لیکن جناب
قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے چنانچہ ہم بھاگ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے

ایک ڈنڈا ہمارے رسید کیا جو اتفاق سے ہمارے بھاگتے ہوئے پیروں میں سے ایک پر پڑا اور سچ پوچھئے تو خدا نے بڑا فضل کیا ہم بال بال بچ گئے اب ہم ایک درخت کے قریب پہونچکر ذرا اپنا پیر سہلا رہے تھے کہ ایک گھوڑے سوار لال پگڑی والے نے کچھ ہماری شان میں گستاخانہ الفاظ کہنے کے بعد اس درے بلم رسید کیا کہ ہم نے آنکھیں بند کر کے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور اپنے شہید ہو جانے کا یقین کر لینے کے بعد مطمئن ہو گئے لیکن آنکھ کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بلم درخت پر اس طرح سے پڑا تھا کہ ہم صاف بچ گئے تھے لیکن جناب اس حادثہ کے بعد جو ہم بھاگے ہیں تو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور دفتر میں آکر دم لیا۔

غالباً ہمارے پٹنے کا یہ واقعہ تو قومی نقطۂ نظر سے بجائے باعث شرم ہونے کے ہمارے لئے باعث فخر ہوگا اگر درخت کے حائل ہو جانے سے وہ بلم ہمیں پڑتا تو آج ہم کو بھی وہی درجہ حاصل ہوتا جو لاجپت رائے آنجہانی کو حاصل ہے لیکن اس کے بعد کے واقعات قومی اور غیر قومی ہر نقطۂ نظر سے شرافت پر پانی پھیر دینے والے ہیں مگر مجبوری ہے کیا کیا جائے لہذا سنئے اور ہماری نجابت کی داد دیجئے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست سے اسی قسم کے معاصرانہ تبادلہ کی نوبت آگئی، اُن دوست کا نام بتانے میں ذرا ہماری توہین ہوتی ہے۔ بہرحال

خود واقعہ بھی کچھ کم نہیں ہوا اور مطلب تو صرف یہ بیان کرنے سے ہے کہ ہم کیونکر ٹیے
قصہ اصل میں یہ تھا کہ ہمارے وہ کرمفرما ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر بہت سے اپنے
واقعات دُہرانا شروع کر دیتے تھے جو ہماری دُکھتی ہوئی رگ والے واقعات
ہوتے تھے لیکن اس بندۂ خدا کو خدا معلوم اس میں کیا لطف آتا تھا کہ لڑائی تو
ہوئی آم کے سلسلے میں اور دُکھڑا رونا شروع کیا انھوں نے املی کا۔ چنانچہ جس واقعہ کا
ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اسی طرح رونما ہوا کہ وہ اپنے چند دوستوں کے سامنے
قابلیت بگھار رہے تھے کہ ہم بھی جا پہونچے اور لگے ان کی قابلیت کا بھانڈا
پھوڑنے اُسوقت تو خیر وہ اس طرح خاموش رہے کہ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا اور
ایک جاتا تھا لیکن جب ان کے دوست اُٹھ کر چلے گئے تو انھوں نے اپنی
برہمی کا اظہار شروع کر دیا۔ اور ہمارے اس سوال پر کہ "کیوں چپ کیوں ہو؟"
وہ برس پڑے کہ:۔

"میں آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اگر آپکی سنجیدگی کا یہی حال ہو کہ
آپکو آئے گئے لوگوں کا بھی خیال نہیں تو آپ مہربانی فرما کر مجھکو معاف رکھیں
خود آپکی تو خیر کوئی پوزیشن ہے ہی نہیں لیکن آپ کو دوسرے کی پوزیشن کا بھی
خیال نہیں ہو تو جناب میں باز آیا"

اب بتائیے ان حضرت کے یہ الفاظ کس قدر مشتعل کرنے والے تھے
لیکن چونکہ غلطی خود ہماری تھی لہذا ہم نے انتہائی ضبط سے کام لے کر کہا:۔

"جناب والا مجھکو یہ نہیں معلوم تھا کہ آپکی طبع نازک کو میرا نداق اس قدر گراں گزرے گا اگر آپ نہیں ملنا چاہتے تو بسم اللہ"

وہ۔ آپنے آج ہی یہ کوئی نئی بات نہیں کی ہو بلکہ اب تو یہ آپکی عادت ہوتی جاتی ہو اور اگر یہی حال ہو تو انشا اللہ میں کیا کوئی کبھی منہ لگانا پسند نہ کرے گا۔

میں۔ بندہ نواز معاف فرمائیے گا۔ آپکی طرح کوئی اور خردماغ نہیں ہو تبھی آپ تو میں نے خود کان پکڑے کہ اب کبھی نہ ملوں گا۔

وہ۔ اب آپ کہلواتے ہیں تو سنئے کہ آپکے تمام دوست جن سے ذرا بھی سنجیدگی چھو گئی ہو آپسے نالاں ہیں اور کوئی آپسے ملنا پسند نہیں کرتا اور واقعی اس لونڈھے پن کو کوئی کہاں تک برداشت کرے۔"

میں۔ میرا لونڈا پن آپکی خردماغی سے پھر بھی اچھا ہو اور معلوم نہیں آپ کو کس بات پر اتنا ناز ہو۔ اگر کچھ ہوتے تو خدا جانے کیا کرتے کچھ نہونے پر تو یہ حال ہو۔

وہ۔ میں اس قسم کی بدتمیزی کی گفتگو سننا نہیں چاہتا۔

میں۔ میں آپکے ایسے بدتمیزوں سے گفتگو کرنا بھی نہیں چاہتا۔

وہ۔ آپ اپنی زبان روکئے ورنہ اس گستاخی کی سزا کو پہونچئے گا۔

میں۔ اپنے حواس میں رہو حد سے نہ بڑھو۔ ورنہ یہ تمام اکڑ دھری رہجائے گی۔

وہ۔ (گلا پھاڑ کر) خاموش ------ بدتمیز کہیں کا۔
ہم۔ (گلا پھاڑ کر) چُپ ----- بیہودہ ----- بدتمیز کہیں کا۔
تم خود بدتمیز۔

اس کے بعد پہلے وہ کرسی سے کھڑے ہوئے اور اُن کے بعد ہم سب سے پہلے تو بیچ میں رکھا ہوا حقہ گرا اس کے بعد ہم اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ ہم کو یہ معلوم تھا کہ ہم کمزور ہیں دُبلے پتلے ہیں اور وہ ہاتھ پیر کے اچھے تھے لیکن غصہ اور اشتعال، اشتعال اور غصہ یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا، چنانچہ ہم نے میز سے کرسی اور کرسی سے آرام کرسی پر گرنا شروع کیا لیکن ہر مرتبہ گرنے کے بعد اس جوش کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے کہ ابھی یا تو ہم ہی نہیں یا یہ مردود نہیں۔ لیکن سچ ہے کہ کمزوری مار کھانے کی نشانی ہوتی ہے چنانچہ آخر میں اُنھوں نے ہم کو مسہری پر گرا کر ایک آدھ ایسا گھونسا رسید کیا کہ ہم کو جوابی گھونسے کا ہوش نہیں رہا اور ہم نے ان کے گھٹنے سے دبے ہوئے سینہ سے بمشکل آواز نکال کر کہا۔

"یہ شرافت ہے، کمینہ پن۔ شہدہ پن، بدمعاشی"

اور اس کے بعد انھوں نے جب ہم کو چھوڑا تو ہم مقابلہ پر نہیں آئے بلکہ نہایت جوش کے ساتھ تنتناتے ہوئے اُن کے کمرے سے نکل گئے اور

اس واقعہ کے دو مہینے بعد تک ہم دونوں آپس میں نہیں ملے لیکن یہ واقعہ آج ہمارے قلم سے نکلا ہو ورنہ اُسی دن جب گھر میں سب نے پھٹے ہوئے کپڑے اور چوٹیں دیکھیں اور سبب پوچھا تو ہم نے کہدیا تھا کہ ایک پاگل کتا لپٹ گیا تھا خیریت یہ ہوئی کہ ہم گرے بھی اور اس نے ہمارے کپڑے بھی نوچے لیکن اس کا دانت کہیں نہیں لگا، مگر آج یہ راز کی بات ہماری زبان سے نہ سہی بہرحال ہمارے قلم سے نکل ہی ہو اب چاہے ہم کو کوئی ذلیل سمجھے یا کمینہ!

ایک مرتبہ ریل میں ہماری شامت آئی اور وہ اس طرح کہ ہم غالباً لکھنؤ سے بھوپال جا رہے تھے چنانچہ صبح کے وقت جب لکھنؤ جھانسی اکسپرس سے اُتر کر دہلی بمبئی اکسپرس پر بیٹھے تو بڑی کشمکش تھی اول تو تیسرے درجہ میں ہمیشہ کشمکش ہوتی ہو لیکن اُس دن کچھ خلاف معمول کشمکش زیادہ تھی بھی اور مسافر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کے اوپر ایک سوار تھا لیکن ہم کو بڑی عمدہ جگہ مل گئی تھی اور ہم بڑے مزے میں سفر کر رہے تھے۔ بینا جنکشن پر گاڑی کے ٹھہرتے ہی ہماری جو کمبختی آئی تو ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے پلیٹ فارم پر آگئے اور اُس وقت تک ٹہلتے رہے جب تک گاڑی نے سیٹی نہیں دی۔ لیکن اب جو ہم گاڑی میں آ کر دیکھتے ہیں تو ہماری جگہ پر ایک اور صاحب نہایت اطمینان سے تشریف رکھتے تھے، واللہ ان کا اطمینان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا یہ جگہ

اُن ہی کی تھی اور ہم زبردستی یا ان کی عنایت سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ہم کو دیکھتے ہی نہایت لاپروائی سے کھڑکی کے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ہم سمجھے کہ شاید یہ ہوا کھانے کیلئے آ بیٹھے ہیں ابھی اُٹھ جائیں گے لہذا ہم نے مارے شرافت کے اُن سے اُٹھنے کا تقاضا بھی نہیں کیا اور چپ کھڑے رہے لیکن وہ اُٹھنے ہی کا نام نہ لیتے تھے یہاں تک کہ ہم کو کھڑے کھڑے آدھ گھنٹہ ہو گیا جب ہم نے دیکھا کہ ان کا اطمینان بدستور قائم ہے اور وہ جگہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے تو ہم نے اُن سے عرض کیا:-

"اب ہٹیے جناب میں بیٹھوں گا"

اُنھوں نے نہایت لاپروائی سے جواب دیا:-

"اُدھر بیٹھ جاؤ"

ہم۔ آپ ہی نہ وہاں چلے جائیں میرا تو یہاں سامان وغیرہ رکھا ہے۔

وہ۔ سامان رکھا ہے تو ہم کیا کریں؟

ہم۔ ارے بھئی یہ تو میری جگہ ہے۔

وہ۔ کیا تم نے یہ جگہ خریدی ہے جو تمھاری جگہ ہے۔

ہم۔ خریدی تو نہیں ہے مگر میں یہیں پر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ۔ تو اب ہم بیٹھے ہیں تم وہاں بیٹھو۔

ہم۔ یہ تو اچھی زبردستی ہے۔
وہ۔ زبردستی کاہے کی کیا ہم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے؟
ہم۔ یہ کون کہتا ہے کہ تم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے مگر دوسرے کی جگہ پر تو نہ بیٹھو۔
وہ۔ خیر ہم تو نہیں ہٹیں گے۔
ہم۔ ہٹو گے کیسے نہیں؟
وہ۔ اچھا دیکھتے ہیں تم ہٹا لیتے ہو۔
ہم۔ نہیں ہٹو گے؟
وہ۔ نہیں!
ہم۔ نہیں ہٹو گے؟
وہ۔ نہیں!
ہم۔ کیوں آفت مچاؤ گے ہم پھر کہتے ہیں ہٹ جاؤ۔
وہ۔ کہہ تو دیا ہم نہیں ہٹیں گے۔
ہم۔ تم نہیں ہٹو گے؟
وہ۔ ہاں نہیں ہٹیں گے!

اب ہم کو بڑا تاؤ آرہا تھا اور ہم مارے غصہ کے کانپ رہے تھے اسوقت اگر بس چلتا تو اس بدتمیز کو مارتے مارتے فرش کر دیتے۔ مگر کیا کریں سفر کا معاملہ تھا اور ہم تنہا تھے لیکن چپ ہو رہنا بھی کوئی

معنی نہ رکھتا تھا ہم نے پھر کہا:۔

"تم نہیں ہٹو گے؟

وہ۔ نہیں۔نہیں۔نہیں۔

اب ضبط ہمارے اختیار میں نہ تھا ہم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھانا چاہا تو اُس نے ڈھکیل دیا اور ہم سامنے والی سیٹ کے مسافروں پر گر پڑے۔ لیکن اُٹھکر ہم نے پھر اُس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ جھٹکا دیکر کھینچا لیکن اُس نے دوسرے ہاتھ سے ہمارے منھ پر تڑسے وہ چانٹا رسید کیا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ

چمکنے سے جگنو کے تھا وہ سماں
ہوا پر اُڑیں جیسے چنگاریاں

والا منظر آگیا اور معلوم ہوا کہ جیسے ہم سنیما دیکھ رہے تھے۔ اور یہ فلم جل جانے والا اندھیرا اور روشنی تھی لیکن دو ہی تین سکنڈ کے بعد ہم پھر اُس نامعقول پر جھپٹے اور خدا کی قسم اگر دوسرے مسافر بیچ میں نہ آجاتے تو اُس بدمعاش کو مارتے مارتے اُلو کردیا تھا۔ لیکن ہم کو ہمارے ہمسفروں نے ایسے گھیرا کہ ہم گالیاں تو دیتے رہے لیکن ہاتھ نہ ہلا سکے بہرحال یہ واقعہ بھی خواہ کسی وجہ سے ہو لیکن ہمارے

مار کھا جانے کے واقعات میں سے ایک ہے۔

ان تین واقعات کے بعد باہر کا تو کوئی ایسا واقعہ یاد آتا نہیں لیکن گھر میں یہ اتفاق ہوئے ہیں مثلاً شادی ہی میں پھولوں کی چھڑیوں سے پٹے تھے۔ لیکن ہم ان واقعات پر روشنی ڈالنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں اسلئے کہ اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں وہ تو کہئے برادرم عظیم بیگ صاحب چغتائی کی مروت تھی ورنہ یہی واقعات مرتے دم تک ہمارے قلم یا ہماری زبان سے نہ نکلتے۔

علاج بالغذاء

عِلاج بالغِناء

بیجئے اور سنئے کہ یورپ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے یہ جدید تحقیقات فرمائی ہے کہ اکثر بیماریوں کا علاج گانے کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے اور بہت سے ایسے امراض ہیں جنہیں بجائے دوائیں استعمال کرنے کے یہ طریقہ بحد مفید ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مستقبل قریب میں لوگ ادویہ کا استعمال بالکل ترک کر دیں گے اور موسیقی کے ذریعہ بیماروں کا تدارک کریں گے۔ اسی طریقہ کو تمام اطبا اختیار کریں گے۔ موسیقی سے نہ صرف ذہنی اور دماغی بلکہ جسمانی علاج بھی ہوگا۔

اگر ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق صحیح ہے تو سب سے پہلے اُن کو اپنی اور اپنے ہم پیشہ طبقہ کی خیر منانا چاہئے اور حصول معاش کا کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا چاہئے اسلئے کہ موسیقی سے بیماریوں کا علاج عام رواج پانے کے بعد یہ تمام دُنیا کے ڈاکٹر اور حکیم تو بس ٹرڈُوں ٹوں رہ جائیں گے۔ البتہ ان کی جگہ پر مس زہرہ بائی، مس اللہ رکھی۔ مس بتن جان، مس مٹن جان، مس گمّن جان مس بینظیر مس کجن بائی اور ماسٹر نثار وغیرہ کی پریکٹس خوب چلے گی اور ہر شہر کے

چکلوں میں ہر کمرے پر مطب کھُل جائیں گے۔ یہی کم خرچ بالا نشین گانے والیاں
سول سرجن بھی ہوا کریں گی اور اسسٹنٹ سرجن بھی اور یہی تمام آلات موسیقی
آلات طب کا کام دیں گے۔

جب یہ علاج کا طریقہ جاری ہوگا تو غالبًا یہ ہوا کرے گا کہ غریب آدمی
بیمار ہوکر ڈولیوں میں اور یا پیادہ گانیوالوں اور گانیوالیوں کے مکانات اور کوٹھوں پر
جایا کریں گے اور وہ مریضوں کو دیکھکر نسخہ تجویز کریں گی کہ اسکو ٹھمری سے فائدہ
ہوسکتا ہے یا بھیرویں سے۔ غزل اسکے لئے مفید ہوگی یا دادرا۔ اور جیسی بھی مرض
کی نوعیت ہوگی ویسا ہی علاج شروع کردیا جائیگا اسی طرح امراء ان مغنی طبیبوں کو
فیس دیکر اپنے گھر پر بلایا کریں گے اور وہ بجائے تھرمامیٹر اور دوسرے آلات کے
طبلہ اور سارنگی وغیرہ لیکر موٹر پر نہایت ٹھاٹھ سے اُن کے یہاں جایا کریں گے
اُن کی نبض دیکھیں گے کہ کونسا راگ چھیڑ رہی ہے۔ پھر اُسی کے مطابق کوئی چیز
اُن کو سُنا کر اپنی فیس لیں گے اور کسی دوسرے مریض کے یہاں چلے جائینگے
لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب یہ طریقہ علاج رائج ہو جائیگا تو لیڈی ڈاکٹروں کی
کثرت ہوگی اور مرد زیادہ تر لیڈی ڈاکٹروں ہی کا علاج کریں گے۔

اگر اسوقت بھی نسخہ لکھنے کا طریقہ رائج رہا تو یہ ہوا کرے گا کہ
ڈاکٹرنی صاحبہ مع اپنے سازندوں کے جو اُسوقت کمپونڈر کہلائیں گے
مریض کے یہاں جائیں گی اور اُس کا معائنہ کرنے کے بعد پہلے تو یہ طے کرینگی کہ

کونسا مرض ہو یعنی دق ہو یا ہیضہ اور اس کے بعد پھر اس طرح نسخہ لکھیں گی۔

ھو

نام مریض ۔۔۔۔۔۔۔۔ چودھری عطاء اللہ شاہ

مرض ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ضعف معدہ

معالج ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مس زہرہ بائی گورکھپوری

"مار گیوں سے دل پہ برچھی بخر کی" گوش کنند۔ وعقب آن

"جیا بدا ہالے ڈولے ہو" سماعت کنند۔"

یہ تو ہوا یونانی طریقۂ علاج ۔ اسی طرح انگریزی میں بھی انگریزی نغمات بطور دوا تجویز کئے جائیں گے۔ اب دیکھئے کون سے ملاجی ڈاکٹر صاحب "علاج بالرقص" ایجاد فرماتے ہیں۔
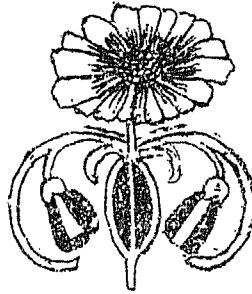
پان

پان

شادی کے معاملہ میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہی ہو کہ لڑکے اور لڑکی میں رفتار ذہنی کی یکسانیت ضرور ہو ورنہ شادیاں عام طور پر طلاق ورنہ شادی اور طلاق کے درمیان کا کوئی درجہ ہو کر رہجاتی ہیں اور اسی درجہ میں زن وشو کو اپنی تمام زندگی بسر کرنا پڑتی ہو۔ ہم اس اصول سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ہم نے اپنی متعدد نسبتیں محض اسی وجہ سے نامنظور کردی تھیں کہ لڑکی یعنی وہ جو ہماری دُلہن نہ بن سکی ہماری اُفتادِ طبیعت سے مختلف تھی لیکن آخر کار ہم کو اپنے انتخاب میں کامیابی ہوئی اور ایک ایسی خاتون جو "من توشدم تو من شدی" کی پوری اہل نظر آتی تھی ہماری رفیقۂ حیات بن گئی، یہاں سے ہماری داستان مصیبت کا آغاز ہوتا ہو اور ہم داستان الم سنانے سے قبل چاہتے ہیں کہ اہل دل اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ لیں۔

میں چائے کا عادی تھا۔ وہ بھی چائے کی عادی تھیں۔ میں دن چڑھے سوکر اُٹھتا تھا اور وہ اُٹھنے کے بعد اُن کو اُٹھاتا تھا میں مرچ بہت کھاتا تھا وہ اس معاملہ میں میرے بھی کان کاٹتی تھیں مجھکو ناول پڑھنے کا شوق تھا اور وہ ناول سننے کی عادی تھیں، میں نماز سے جان چُراتا تھا اور

- اور اُنھوں نے آجتک نماز پڑھی تک تھی، مجکو گانے سے ذوق تھا اور وہ گنگناتی تھیں، میں خطوط کے جواب دینے میں کاہل تھا اور وہ جواب طلب خطوط آنے کی شدید مخالف تھیں، مختصر یہ کہ تمام عادات و خصائل میں وہ تقریبًا میں تھیں، اور میں تقریبًا وہ تھا۔ لیکن پان کے معاملہ میں میرے اور اُن کے تعلقات بالکل ایسے ہی تھے جیسے مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی کے ہوسکتے ہیں۔

میں پان کو غازۂ روئے بہار اور عنوان رنگین لب لعلین یار سمجھتا تھا اور وہ پان کو خدا کی مار کہا کرتی تھیں اُن کے دانت ہمیشہ سپید بٹن نظر آتے تھے اور میرے منھ کو تو خیر وہ ہمیشہ اُگالدان ہی کہا کرتی تھیں مجکو اُن کا وہ رمضان شریف نما منہ بُرا معلوم ہوتا تھا اور وہ لال لال منہ سے نفرت کرتی تھیں مجکو اُن سے اس معاملہ میں ایک خفیف سی شکایت تھی اور اُنکو مجھ سے اسی سلسلہ میں کچھ شکوے تھے۔ مختصر یہ کہ پان ہم دونوں کے درمیان حد فاصل تھا۔

مجھکو شراب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں خدانخواستہ افیونی یا چانڈو باز بھی نہیں ہوں میرے پاس سے کبھی چرس یا گانجہ بھی نہیں پکڑا گیا۔ میں نے کبھی باوجود پان کھانے کے کوکین بھی استعمال نہیں کی۔ میں حقہ اور سگریٹ سے لیکر سگار اور بیڑی تک سے بالکل بے نیاز رہا ہوں۔

البتہ اتنا قصور وار ضرور ہوں کہ پان کا شدت کے ساتھ عادی ہوں اور پان میں صرف اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کے کارخانے کا بنا ہوا اِمتبا کو بھی کھا لیتا ہوں، بس میرا یہی جرم ایسا ہے کہ گویا میں افیونی بھی ہوں اور شرابی بھی، بھنگڑی بھی ہوں اور چرسیہ بھی اور یقیناً اگر میں ان چیزوں میں سے خدانخواستہ کسی کا عادی ہوتا تو بھی میرے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو پان کھانے کے جرم میں ہوتا ہے۔

حالانکہ ان کو جہیز میں بہت سی کارآمد چیزوں کے علاوہ ایک نہایت خوبصورت پاندان بھی ملا ہے لیکن وہ غالباً یہ سمجھتی ہیں کہ جہاں اور بہت سی الّم غلّم۔ جھگڑا۔ ٹٹم چیزیں ملی ہیں وہاں ایک چیز یہ بھی مل گئی ہے کہ ہمیشہ مقفّل الماری کے اندر رکھی رہے۔ رہ گیا اُگالدان شاید اس کو وہ یہ سمجھتی ہیں کہ اس میں دودھ کی طرح سفید اور دُھنکی ہوئی روئی کی طرح شفّاف بھوک تھوکا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ خون کی قے کی طرح پان کی پچکاری سے اسکو ناپاک کیا جائے یا وہ اُگالدان سے بھی گلاس وغیرہ کا کام لینا چاہتی ہیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو نہ یہ بات ہے نہ وہ صرف پان سے دشمنی ہے اور کچھ نہیں۔

سب سے پہلے تو جب اُن کو یہ علم ہوا کہ میں پان کھانے کے معاملہ میں پَن چکّی واقع ہوا ہوں تو اُنھوں نے اپنے عزہ سانہ سحر سے کام لیکر مجکو پان سے

توبہ کرنے پر مجبور کرنا چاہا لیکن وہ اس سے بےخبر تھیں کہ جب مجھکو پہلی مرتبہ
یہ معلوم ہوا کہ دُلہن کی زندگی میں پان کی کمی ہو تو میں نے اُن کو پان
کھلانے کی کوشش کی تھی یہ اور بات ہو کہ نہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب
ہوئیں نہ میں اپنی کوشش میں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دونوں برابر
رہے اسوقت سے آجتک ہم دونوں کے محبت بھرے دلوں میں
پان کے معاملہ میں ایک ایک خواہش موجود ہو اور اس کا مختلف
طریقوں پر اظہار ہوتا رہتا ہو۔ اُن کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ
وہ باوجود انتہائی مخالفت بلکہ نفرت کے اپنے ہاتھوں سے میرے لئے
پان بنائیں لیکن اسکو بھی میرا دل اور میرے گلے ہی خوب جانتے ہیں کہ
اُن کے ہاتھوں کا پان کھاکر میرا کیا عالم ہوتا ہو۔ بارہا تو اُن کے
دست نازنین کی گلوری نے دو دو اور تین تین فاقے کرائے ہیں کہ منہ کے
ٹکڑے اُڑ گئے اور ہم کھانے پینے سے معذور ہوکر رہ گئے اسکے علاوہ
ہمارے دوستوں کو بھی ذرا کم جرأت ہوتی ہو کہ وہ ہمارے یہاں آکر پان
کھائیں اول تو اُن کو پان کے ساتھ بہت سے کوسنے بھی کھانا پڑتے ہیں
دوسرے اگر پان کھا بھی لیتے ہیں تو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہو خیر یہ تمام
حالتیں تو قابل برداشت ہیں لیکن ستم تو یہ ہے کہ ہماری گھریلو زندگی
میں ایک اجتماع ضدین موجود ہے اور ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان

یہ کمبخت پان ایک وسیع خلیج کی طرح حائل ہو مجھکو اپنی بیوی سے محبت نہیں بلکہ عشق ہو بشرطیکہ وہ میرے پان کے معاملہ میں دخل در معقولات نہ کریں اسی طرح میری بیوی کو مجھ سے بے انتہا محبت ہے بشرطیکہ میں پان چھوڑدوں لیکن نہ "یہ" ہوتا ہے نہ "وہ" اور ایک اندرونی کشمکش جاری ہے۔

بیگم صاحبہ اس قسم کے موقعے ڈھونڈھا کرتی ہیں کہ وہ پان کے خلاف احتجاج کرسکیں اور یہاں اس قسم کے موقعوں کی تلاش رہتی ہو کہ اُن کو پان کھلا دیا جاوے کبھی وہ کامیاب ہوجاتی ہیں اور کبھی ہم، لیکن جب دن سے ہماری سُرخ رنگ کی رال اُن کی پیازی رنگ کی ساری پر پڑ گئی ہے اُنھوں نے ہم سے اب پان کبھی نہ کھانے کی ایسی قسم لی ہے جو چوری چھپے تو خیر ٹوٹتی ہی رہتی ہو لیکن علانیہ طور پر ہم سے یہ ناممکن ہے کہ اُن کے سامنے پان کھائے ہوئے چلے جائیں۔ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہم باہر سے گھر میں جاتے وقت منہ صاف کرنا بھول گئے اور جب بالکل اُنکے سامنے پہونچے تو کہنا ہی پڑا کہ" اب تو پان کی عادت کچھ ایسی چھوٹی ہو کہ سلیم نے زبردستی پان کھلا دیا مگر پان سے ایک عجیب قسم کی متلی سی محسوس ہورہی ہو لاؤ ذرا پانی کلّی کرلوں" یہ گرہ ھنت اُنکو دن بھر خوش رکھنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور اس قسم کی تصنیفیں

چنداں دشوار نہیں ہوتیں لیکن آپ ہی بتائیے کہ جب ایک دن وہ ہماری جیب سے پانوں کی بھری ہوئی ڈبیہ برآمد کریں تو ہمارے پاس سوائے خودکشی کے کیا چارہ ہو سکتا ہے مگر وہ اللہ داد دیجئے گا ہماری جسارت کی کہ جیسے ہی اُنھوں نے ڈبیہ نکالی اور ہم زور سے چیخے:۔

"اُس کے پان صرف نہ کرنا یہ اسٹیشن جارہے ہیں، تمھارے والد کے پیر صاحب کو دینا ہیں وہ کلکتہ جاتے ہوئے اِدھر سے گذریں گے۔"

یہاں بھی کامیابی حاصل ہوئی اور بگڑی ہوئی بات بن گئی۔ لیکن واقعات کچھ ایسے بھی ہو جاتے ہیں کہ چوری کھل کر رہتی ہے اور راز افشا ہی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم تو دفتر میں پان کھانے کے علاوہ گھر کے مردانے حصہ میں بھی آزادی کے ساتھ پان کھاتے ہیں۔ اس لئے وہاں کس کا ڈر، مگر جناب اس حادثہ کو کچھ ہمارا دل ہی خوب جانتا ہے کہ جب ہم نے دو تین گلوریاں ایک ایسے نسان کی طرح جو سات فاقوں سے ہو بیک وقت منہ میں رکھیں اور ایک دم سے بہت سا کتھا کو کھا یا دیسے ہی وہ زنانہ مکان کا دروازہ کھول کر کمرے میں موجود۔ اب ہم ہیں کہ نہ نگلا جائے اور نہ تھوکا جائے اور وہ ہیں کہ جھوٹے کو تا بہ خانہ پہونچانے پر

تلی ہوئی ہیں وہ پوچھتی ہیں:۔
"یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟

ہم۔ قوں قوں قنق قہیں۔
وہ۔ مجھے گونگوں کی طرح باتیں اچھی نہیں لگتیں۔
ہم۔ قہنہ، قہنہ، قہنہ،
وہ۔ پھر وہی؟
ہم۔ (پیک نگلنے کی کوشش میں ناکام رہکر) قق، تق، تق
وہ۔ ذرا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پان کھاکر بات کررہا ہو۔
ہم۔ قہہ، قہہ، قہہ،
وہ۔ (ذرا مشکوک ہوکر) اچھا مذاق ختم کرو۔ یہ بتاؤ کہ آج بھی باغ چلوگے یا نہیں؟
ہم۔ قانہہ، قانہہ،
وہ۔ یہ کہئے منہ میں پان ٹھنسا ہوا ہے۔
ہم۔ . . . .
وہ۔ اور یہ شاہ صاحب والی ڈبیہ بھی رکھی ہے جو پرسوں آپکو اسٹیشن پر دینا تھی۔
ہم۔ -

وہ۔ " چھوٹ چکا تم سے پان۔ ہیں کہتے کہتے مر بھی جاؤں گی تم سے۔ پان نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ قسمیں کھائی گئیں تھیں۔"

یہ کہکر وہ تنتناتی ہوئی گھر میں چلی گئیں اور ہم اب تک یہی سوچ رہے ہیں کہ آخر کیسے نبھے گی؟

ظرافت لطیف پر قابل قدر کتابیں
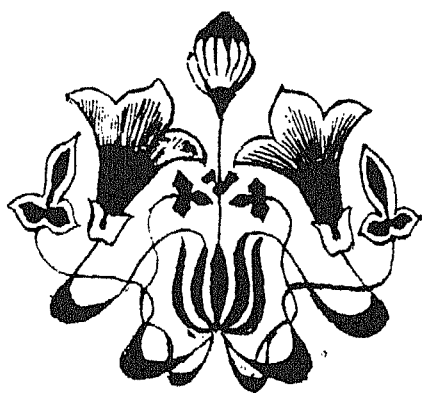
عشق کی گولیاں

عشق کی گولیاں

یہ مضمون مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کی ایک خاص جدت کا نتیجہ ہے
انھوں نے اسکو ناتمام لکھکر مختلف رسائل مین نقلین روانہ کیں تاکہ ملک کے
دوسرے مزاحیہ نگار اسکو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے مکمل کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں
جناب شوکت تھانوی کو بھی دعوت دیگئی "اودھ پنچ" میں انھیں کا پورا کیا ہوا
مضمون شائع ہوا۔ نیرنگ خیال، عالمگیر، ساقی، اور ہمایون کو بھی اسکی
نقلیں روانہ کی گئیں تھیں اور غالباً وہاں بھی یہی مضمون دیگر حضرات کے
قلم سے شائع ہوا۔ سب سے آخر میں خود مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب
بھی اسے اپنے خیال کے مطابق مکمل فرمادیں گے۔ یقیناً یہ طریقہ مختلف
حضرات کے ذوق کے امتحان کا بہت دلچسپ ہے، اور مجھے اُمید ہے کہ اسکے
بعد جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کسی شخص ثالث کو اس فیصلے کا بھی
اختیار دیں گے کہ وہ ان تمام مضامین پر تنقید کر کے سب سے بہتر پیوند لگانیکو
منتخب کرے ------------ نیاز فتحپوری

از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

ناصر کو ہیں کیا اُسکے سارے دوست بیوقوف سمجھتے تھے۔ اور کیوں نہ سمجھتے
جس بھلے آدمی کا سر کھوپرے کی بٹیا ہو اُس میں عقل ہی کہاں سے آنے لگی اور

آنے لگی تھی تو کتنی آنے لگی۔ بیچارہ چار دفعہ انٹرینس کے امتحان میں بیٹھا اور سب مضمونوں میں فیل ہوا۔ اللہ نے ماں باپ کو روپیہ دیا تھا جھٹ اٹھا، ولایت بھیج دیا۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ولایت کی کچھ آب وہوا ہی نئی ہے یا وہاں والے طالبعلموں کو کتابیں گھول کر پلا دیتے ہیں کہ یہاں سے اَن پڑھ جاؤ اور تین چار ہی برس میں بی۔ اے۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ ڈی ہو کر آجاؤ۔ یہاں ناصر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یا تو کسی طرح انٹرینس میں پاس ہی نہ ہوتے تھے یا ولایت جاتے ہی زنازن امتحانوں میں پاس ہونے لگے۔ اور تین ہی برس میں بی اے ہو کر ڈاکٹری کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ بڑی نوابی سے وہاں پانچ برس گذارے امتحان میں بیٹھے پاس ہوئے اور سند مل گئی کہ آج سے اس شخص کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے زہر دیکر مار ڈالے جسپر چاہے چھری چلا دے۔ جس کو چاہے عدم آباد پہونچا دے کسی قانون کی رو سے اس کے مقابلہ میں ضرب شدید زہر خورانی یا قتل عمد کا مقدمہ قائم نہ ہو سکے گا۔ خیر پڑھائی سے فارغ ہو کر گھر آئے اور بہت دھوم دھام سے آئے، ماں باپ کے دل باغ باغ ہوئے قبرستان والوں کے ہاں عید ہوئی مریضوں اور بیماروں کی موت آئی۔ میاں ناصر نے اپنی دوکان پھیلائی اور ملک الموت نے ان کے نام سے اپنے دفتر میں ایک نیا کھاتہ کھول دیا۔

میرے بچپنے کے دوست اور گہرے دوست تھے میں بھی ملنے گیا۔
شکل و صورت میں تو کچھ فرق نہیں آیا تھا جیسے کالے پہلے تھے ویسے ہی
اب بھی تھے۔ ہاں صابن اور کریم کے رگڑوں نے چمڑے کو ذرا چمکا دیا تھا
مانگ سیدھی سے آڑھی ہو گئی تھی۔ ترکی ٹوپی کی جگہ ہیٹ نے شیروانی کی
کوٹ نے اور پائجامہ کی پتلون نے لیلی تھی۔ مونچھیں منڈنے سے ذرا مردانہ
شکل بھی نکل آئی تھی۔ زبان میں تیزی آگئی تھی لیکن اختصار اور لہجے کی کمی ان کی
گفتگو کو بےمعنی سا کر دیتی تھی۔ بات شروع کرتے بڑے لوگوں کے مقولے بیان
کرتے اور بہک کر کہیں سے کہیں نکل جاتے۔ ہاں ان کی ایک بات مجھے
بہت پسند آئی کہ جس طرح اکہرے گئے تھے اسی طرح ایک اکن ایک آ گئے۔
ولایت میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہوں تو چھوڑی ہوں۔ لیکن اپنے ساتھ
کوئی دُم چھلّا لگا کر نہیں لائے۔ خیر یہی غنیمت ہوا ورنہ ان سے تو یہ بھی بعید تھا
اور پھر آپ جانتے ہیں کہ ولایتی بیگم صاحبہ اکثر ہم غریب ہندوستانیوں کے ہاں
آتی ہیں تو اینٹھی ہوئی آتی ہیں۔ رہتی ہیں تو دوسروں کی ہو کر رہتی ہیں
اور جاتی ہیں تو لانیوالے صاحب کے سر پر اُلٹا اُسترا پھیر کر جاتی ہیں۔
بھلا میں کیا اور میری بساط کیا۔ ڈیڑھ سو روپے کا سی آئی ڈی انسپکٹر
اسپر ایک بیوی اور دو بچے وہ ٹھہرے امیر ابن امیر اور ولایت کے تعلیم یافتہ
لیکن خدا لگتی کہوں گا کہ وہ بیچارہ جس طرح مجھ سے اور دوسرے دوستوں سے

پہلے ملتا تھا اسی طرح بعد میں ملتا رہا۔ معلوم نہیں کہ اس کا باعث اس کی خاندانی شرافت تھی یا یہ وجہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کے علاوہ دوسروں کے سامنے بیوقوف بننا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے دوستوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کیا جب ملتا بہت محبت سے ملتا، اور اس طرح ملتا کہ یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ یہ شخص دوسرے ولائتیوں کی طرح ہم غریبوں کا دُنیا میں رہنا بے ضرورت سمجھتا ہے۔ یہ سب کچھ تھا مگر مجھے ناصر کی ایک بات سے نفرت تھی وہ ضرورت اور بے ضرورت ہر بات میں خواہ مخواہ دخل دینا اور اپنی رائے ایسے وثوق کے ساتھ بیان کرنا کہ گویا اب اسکی تردید افلاطون ہی کرے تو کرے اور اسکے ساتھ ہی ایسے عجیب غریب واقعات بیان کرجاتا کہ ان کو اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو "سفید جھوٹ" کہا جا سکتا ہے۔ اور جہاں کہیں ڈاکٹری کی بحث آجاتی تو پھر کچھ نہ پوچھیہ وہ وہ قصے شروع ہوجاتے کہ نہ آنکھوں دیکھے اور نہ کانوں سنے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹری ایک ایسا علم ہے جس کو عقل سے کوئی تعلق نہیں اور ایک ایسا فن ہے جو ولایت گئے بغیر حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر اس میں یہ بات نہ ہوتی تو واقعی اس کی صحبت بڑی اچھی صحبت ہوتی لیکن اس کی ان تعلیوں سے طبیعت اُلجھنے لگتی اور جی چاہتا کہ بس اُٹھ بھاگو۔ سب یار دوستوں کو اس سے بس یہی ایک شکایت تھی لیکن صاف صاف کہدینے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی

سب خاموش بیٹھے اسکی بے تُکی باتیں سنا کرتے۔ بے لطف ہو کر اُٹھتے اور گھر پر آکر اس کا مذاق اُڑاتے۔

ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس نے سب دستوں کی دعوت کی، میں بھی گیا، کھانے کے بعد پھر اُس نے وہی بے معنیٰ باتوں کا سلسلہ چھیڑا کسی نے حکیم شریف خاں کی معجون کی تعریف کر دی کہ اعضائے رئیسہ کے لئے اس سے بہتر دوا ملنی مشکل ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ناصر تو بگڑ ہی گیا کہنے لگا کہ "ادھر حکیم بھی اب اس قابل ہو گئے کہ نسخہ ترتیب دے سکیں اور ہندوستان کی ہٹریل دوائیں بھی ایسی ہو گئیں کہ اعضائے رئیسہ کو تقویت پہونچائیں یاروں تم کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک فن کو جانتے نہیں اور خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑا دیتے ہو۔ ذرا ولایت جاؤ تب معلوم ہو گا کہ طب کا علم کیا ہے اور علاج کس طرح کرتے ہیں۔ جب میں جرمنی گیا تھا تو ڈاکٹر اسٹریس مین سے بھی پڑھنا پڑا۔ انھوں نے ایک ایسا عرق ایجاد کیا ہے ایک بوند روزانہ پلا دینے سے آٹھ دن میں انسان کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔ احسان بیچ میں بول اُٹھا کہ "یار عزیز تم تو جیسے لڑ بڑ گئے تھے ویسے ہی آ گئے، ایک آدھ بوند تم بھی پی آئے ہوتے۔"

ناصر نے کہا کہ "آخر میں کیوں پیتا۔ مجھ میں ایسی کونسی کسر ہے جو خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے علاج کراتا۔"

احمد سے بھلا کیا چُپکا رہا جاتا وہ بولے "مگر یار ڈاکٹر اسٹریس مین تو علاج نہیں کرتے وہ تو معاشیات کے ڈاکٹر ہیں"

اب ناصر کی بے حیائی دیکھئے کہ بجائے قائل ہونے کے اُلٹا احمد سے لپٹ گیا اور کہنے لگا کہ "ماشاء اللہ آپ بھی چڑ کنے لگے ہم نے چھ مہینے تک ڈاکٹر اسٹریس مین سے جراحی سیکھی تو ہم ہوئے جھوٹے اور آپ ہوئے سچے ا ذرا سوچ سمجھ کر بولا کرو ورنہ لوگ بیوقوف کہیں گے۔ آج تو یہ کہا ہو کل شاید یہ کہو کہ ڈاکٹر مارگولیتھ کو بھی ڈاکٹری نہیں آتی میرے آنے سے کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہو کہ ڈاکٹر مارگولیتھ نے ایسی گولیاں ایجاد کی ہیں کہ تم جیسا بیوقوف شخص بھی چالیس روز تک کھائے تو خاصہ بھلا آدمی ہو جائے۔"

مجید نے ذرا مسکرا کر کہا کہ "ہاں میاں ناصر! یہ تو بتاؤ کہ تم نے بھی ان گولیوں کا استعمال کیا ہو! جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آئے۔ یار ہمیں بھی تھوڑی سی منگا دو یا کم سے کم پتہ ہی بتا دو یہ وہی مارگولیتھ ہیں نا جو آکسفورڈ میں پروفیسر ہیں"؟

ناصر نے کہا کہ "ہاں یہی ڈاکٹر ہیں۔ جب تم کو پتہ معلوم ہو تو پھر مجکو بیچ میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہو۔ خود ہی کیوں نہیں منگا لیتے مگر یار یہ گولیاں ہیں بہت مہنگی"۔

یاروں میں یہ نوک جھونک ہو رہی تھی۔ میں چپکا بیٹھا سن رہا تھا۔
خبر نہیں کیوں میاں ناصر ایک دفعہ ہی میری طرف مڑ کر کہنے لگے:۔
" ارے بھئی تم نے دیکھا یہ لوگ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے۔ خواہ مخواہ دخل در معقولات دینے لگتے ہیں۔ ذرا تم ہی بتاؤ میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں"
میں اسکی یہ بے تکی باتیں سن سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا سنو! میاں ناصر کل تک اگر تم ایسی باتیں کرتے ایسی نئی نئی ایجادوں کا ذکر کرتے تو میں تم کو یقیناً جھوٹا کہتا مگر کل سے میرے ہاتھ میں ایک ایسا مقدمہ آیا ہے کہ تم جو کچھ کہو سب صحیح ہے۔ جب ہندوستان والے "عشق کی گولیاں" ایجاد کر سکتے ہیں تو ولایت والے جو کچھ نہ کر دکھائیں وہ کم ہے"
عشق کی گولیوں کا نام سن کر سب ہکا بکا سے رہ گئے۔ میاں ناصر بھی بہت کچھ سٹپٹائے آخر کچھ سنبھل کر بولے" ان گولیوں سے عشق کا مرض زائل ہوتا ہے یا پیدا ہوتا ہے"
میں نے کہا" پیدا ہوتا ہے"
ناصر نے کہا" ہرگز نہیں دوا مرض کو زائل کرتی ہے پیدا نہیں سکتی اور پھر عشق کوئی مرض بھی نہیں ہے جو پیدا کیا جا سکے"
میں نے کہا کہ دیکھو میاں ناصر تم نے اپنے اتنے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں میں نے کسی کو غلط نہیں کہا اور نہ یہ کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو

پھر جب میں اپنا دیکھا ہوا واقعہ بیان کرتا ہوں تو تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ
اس کو غلط کہو یا مجھکو جھوٹا سمجھو تم نے جو کچھ کہا وہ صرف زبانی تھا اور میرے
پاس تحریری ثبوت موجود ہے۔ یہ کہکر میں نے اپنی جیب سے ایک پاکٹ بک
نکالی، دو چار صفحے ادھر اُدھر اُلٹے پلٹے اور کہا دیکھو ان گوریوں کا پورا حال
ان کا اقرار اور ان کا تجربہ سب کچھ اسمیں لکھا ہے اور ایسے شخص نے لکھا ہے
جس نے خود ان گوریوں کو کھایا ہے اور اسوقت شہر کے بڑے اسپتال میں
موجود ہے اسکے بعد میں بھی دیکھوں کہ وہ کون ہمت والا ہے جو مجھکو جھوٹا
کہہ سکے میرا یہ کہنا تھا کہ سارے کے سارے دوست کچھ دم بخود ہو گئے
تھوڑی دیر تک تو سناٹا رہا اس کے بعد ہی سب کے سب میرے پیچھے
پڑگئے کہ بھئی وہ قصہ بیان کرو۔ میں نے بہت کچھ ٹالا مگر یہ شیطانی لشکر
کب ماننے والا تھا آخر میں نے کہا کہ دیکھو یارو میں واقعہ تو بیان
کرتا ہوں لیکن ایک شرط ہے تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی میں ہوں،
یہ کارروائی بھی رازکی ہے پہلے یہ اقرار کرلو کہ اس کا ایک حرف بھی ہم
لوگوں کے باہر نہیں جائے گا اور اگر باہر گیا تو پھر جان ہی تمھاری دوستی الغط.
خیر بہت کچھ اقرار مدار ہوئے قسما قسمی ہوئی اور میں نے قصہ یوں بیان
کرنا شروع کیا۔

ہاں تو ہوا یہ کہ پرسوں شام کے کوئی ساڑھے چار بجے میں

کلب جانے کے لئے کپڑے بدل رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ جا کر سنا تو صاحب مجھ سے کہنے لگے دیکھو ابھی ٹھنڈی سڑک پر جاؤ ایک واقعہ ہو گیا ہے اور امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ کل صبح تک مجھ کو پوری رپورٹ دیجائے گی۔ جی تو بڑا جلا کہ آج ٹینس گیا۔ مگر کیا کیا جاتا۔ نوکری ہے نہ بھائی بندی ہے، اسی وقت اُلٹے سیدھے کپڑے پہن ٹھنڈی سڑک پہونچا گیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کا ہجوم ہے۔ بھاڑ چیر کر اندر گیا۔ وہاں کی جو کیفیت دیکھی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں بیچ سڑک پر نواب عاشق حسین خاں پڑے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ڈپٹی معشوق علی خاں کی لڑکی محبوب بیگم کی ساری کا کونہ ہے اور برابر یہ چیخی آوازیں کہے جا رہے ہیں۔ "میں عاشق ہوں میں عاشق ہوں میں یار تمہارا عاشق ہوں"

محبوب بیگم کو تو تم نے بھی دیکھا ہوگا کوئی ۱۷، ۱۸ برس کی لڑکی ہے اسی سال ایف۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا ہے۔ باوجود ماں باپ کے منع کرنے کے پردہ اُٹھا دیا ہے روز ٹھنڈی سڑک پر میموں کی طرح اینٹھتی پھرتی ہے۔ مگر یار وں اسوقت جو اسکی حالت تھی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہونٹ خشک تھے، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے

بیچاری ساری کا پلو چھڑانے کی کوشش کرتی تھی لیکن میاں عاشق حسین کچھ ایسے بھوت بن کر چمٹے تھے کہ کسی طرح نہ چھوڑتے تھے۔ مجھے دیکھکر ذرا اس غریب لڑکی کی جان میں جان آئی۔ میں نے جاتے ہی پہلو تو یہ کیا کہ جھٹکا دیکر اس بیچاری کا پلو چھڑایا۔ ارے بھائی کا پلو چھوٹنا تھا کہ نواب نے "تو ہائے مار ڈالا" کا اس زور سے نعرہ مارا کہ میں بھی پریشان ہو گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو نواب بیہوش پڑا ہے۔ اتنی دیر میں میاں احسان تمھارے چھوٹے ماموں کی موٹر ادھر سے نکلی میں نے موٹر میں نواب کو ڈالا اور شوفر سے کہا کہ ابھی اسپتال لیجا۔ میں بھی آتا ہوں اُسکے بعد تماشائیوں کو ڈانٹا کہ بھائیو تمھیں شرم نہیں آتی کہ ایک غریب لڑکی کا مذاق اُڑا رہے ہو، جاؤ راستہ لو۔ خیر میرے اس کہنے سے وہ لوگ تو چلے گئے۔ اب میں اور محبوب بیگم وہاں رہ گئے میں نے پوچھا کہ محبوب آخر یہ کیا معاملہ ہو تمکو اتنا بھی خیال نہیں ہوا کہ کورٹ شپ بھی کیا تو بیچ سڑک میں۔ تمھارے باپ اور تمھارے خاندان والوں کو لوگ کیا کہیں گے! ایسا ولایتی پن تو شاید یورپ میں بھی نہیں ہوتا۔ میرے اس طرح کہنے سے اس بیچاری کے آنسو نکل آئے کہنے لگی۔ بھائی پہلے آپ قصہ تو سُن لیں اُس کے بعد جو جی چاہے آپ مجھے کہیں۔ میرا اس میں کیا قصور ہو آپ جانتے ہیں کہ

میں شام کو چار بجے ٹہلنے نکلا کرتی ہوں کوئی آٹھ دس دن سے یہ ہونے لگا کہ میں ٹھنڈی سڑک کے پاس پہونچی اور نواب عاشق حسین خاں آ موجود ہو لیے۔ میں سڑک کے ایک کنارے پر چلتی اور وہ دوسرے پر مگر آجتک انھوں نے مجھ سے ایک بات بھی نہیں کی۔ بس ان کا اتنا ہی کام تھا کہ ساری ٹھنڈی سڑک وہ میرے ساتھ ساتھ طے کرتے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ یہ میرے والدصاحب قبلہ کے دوست ہیں۔ میں ان کو بچپن سے جانتی ہوں۔ پھر مجھے ان کے اس طرز عمل سے گھبرانے کی کیا وجہ تھی، لیکن میں دیکھتی تھی کہ ان کی حالت دن بدن ابتر ہو رہی ہے۔ چلنے میں پاؤں تھرتھراتے ہیں۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ خیر ہونے ہوتے آج یہ ہوا کہ چلتے چلتے ان کو چکر آ گیا اور لڑکھڑا کر گر پڑے۔ میں ان کی مدد کو دوڑی پاس بیٹھ کر رومال سے ہوا دینی شروع کی۔ اُنھوں نے آنکھیں کھولیں۔ میں نے ان کی خیریت پوچھی بجائے اسکے کہ وہ میرا شکریہ ادا کرتے یا مزاج کی کیفیت بیان کرتے اُنھوں نے میرا پلو پکڑ لیا اور خبر نہیں کیا واہی تباہی بکنے لگے۔ تھوڑی دیر میں لوگوں کا ٹھٹھ لگ گیا معلوم نہیں کہ آپکو کیسے خبر ہوئی اگر آپ نہ آجاتے تو خدا معلوم میری کیا نوبت ہوتی"۔ آخر عورت ذات تھی، کہاں تک آپکو سنبھالتی، زار و قطار رونے لگی۔ میں نے بہت کچھ

تسلی دی، کرائے کی موٹر منگالی. محبوب کو اس کے گھر پہونچایا اور خود اسپتال پہونچا۔

یہاں پہونچکر کیا دیکھتا ہوں کہ نواب عاشق حسین خاں صاحب پلنگ پر لیٹے ہائے ہائے کر رہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا یہ کیا معاملہ ہے انھوں نے کہا کہ ان کو مرض تو کچھ نہیں ہاں عام کمزوری ہے اور بہت ہے. ڈاکٹر صاحب سے مل کر میں نواب کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ حضرت یہ بیٹھے بٹھائے آپنے کیا آفت بپا کی ہے بھلا اپنے کو دیکھو اور اس لونڈیا کو دیکھو. ہم بھی تو سنیں کہ آخر یہ ہے کیا بات، نواب نے ایک بڑا لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور کہا کہ کیا بتاؤں "میں عاشق ہوں میں عاشق ہوں میں یار تمھارا عاشق ہوں"۔ جب میں بہت سر ہوا تو اُنھوں نے یہ پاکٹ بک مجھے دی اور کہا کہ اس میں میرے عشق کی ساری داستان درج ہے اب جاؤ میرا دل گھبرا رہا ہے یہ کہہ اُنھوں نے پھر وہی اپنی جینی جینی شروع کی کہ "میں عاشق ہوں میں عاشق ہوں میں یار تمھارا عاشق ہوں"

گھر آتے آتے رات ہو گئی تھی اس لئے کھانا دانہ کہاں میں اس پاکٹ بک کو لے کر بیٹھا. اب بجائے اس کے کہ میں خود اس قصہ کو بیان کروں اس کے اندراج پڑھ دیتا ہوں۔"

عنوان ملاحظہ ہو

عاشق حسین خاں کے عشق کی داستان

یوں تو اللہ کا دیا میرے یہاں سب کچھ موجود ہے لیکن وہ چیز جس کے لئے
انسان پیدا ہوا ہے یعنی عشق اس سے میں ابتک نا آشنا رہا عشق مجازی کی بھی
کوشش کی لیکن تھوڑے ہی دنوں میں طبیعت اکتا گئی. عشق حقیقی کے لئے بھی
بہت کچھ نمازیں پڑھیں وظیفے گھونٹے مگر کورے کا کورا رہا، آخر پریشان ہو کر
اسکو بھی چھوڑ دیا. اسوقت میری عمر پچاس سے کچھ اوپر اور ساٹھ سے کچھ کم ہو رہ رہکر
خیال آتا کہ میاں عاشق حسین جیسا تمھارا نامۂ اعمال سیاہ ہے وہ تو تم بھی جانتے ہو
عبادت میں دل نہیں لگتا کم سے کم کسی نہ کسی طرح عشق مجازی ہی کی تکمیل کرلو۔
کیونکہ یہی عشق حقیقی کا زینہ ہے مگر کیا کیا جائے ہزار کوشش کرتا کسی صورت
سے عشق مجازی کی طرف بھی طبیعت راغب نہیں ہوتی تھی. اللہ بڑا مسبب الاسباب
ہے آخر یہ مشکل بھی آسان ہو گئی رسالۂ ندرت کے خاص نمبر میں حکیم مشکل کشا کا
اشتہار دیکھا انھوں نے منطقی دلائل سے یہ ثابت کر کے کہ عشق ایسی چیز نہیں ہے
جو خود بخود پیدا ہو اپنی گولیوں کا اشتہار دیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ اگر
ان گولیوں کے کھانے سے پریشان سے پریشان خیال آدمی بھی عاشق
نہ ہو جائے تو وہ ہر طرح کا ہرجانہ بھرنے کو تیار ہیں۔ اشتہار کی تحریر ایسی
معقول کہ اسکی صداقت پر کسی طرح شبہ ہی نہیں ہو سکتا تھا. اشتہار کی

نقل کئے دیتا ہوں تاکہ آپ بھی ملاحظہ فرمالیں کہ میری رائے صحیح ہو یا غلط۔

عشق کی گولیاں

حکما کا قول ہے کہ عشق بھی ایک مرض ہے

از شوکت تھانوی۔۔۔۔۔۔۔۔جو

عام امراض کی طرح بغیر مادے کے پیدا نہیں ہوتا اور بغیر اخراج مادہ کے دفع نہیں ہوتا۔ انسان میں فطرتاً عشق کا مادہ موجود ہو جس کا ہیجان میں آجانا معمولی انسان کو قیس اور فرہاد کا درجہ دیدیتا ہے ورنہ انسان اپنے مقصد زندگی سے بیخبر رہ کر جس طرح دنیا میں آتا ہو اسی طرح دنیا سے چلا جاتا ہو بلکہ یہ بھی ہوتا ہو کہ اگر عشق کا مادہ ہیجان میں نہ آئے تو انسان کو اندر ہی اندر نہیں معلوم کن کن امراض میں مبتلا کردیتا ہے، ان ہی تمام باتوں کو پیش نظر رکھکر سالہا سال کی تحقیق اور تفتیش کے بعد رفاہ عام کے لئے ہم نے ایسی گولیاں ایجاد کی ہیں جن کے استعمال سے پتھر کی طرح بے حس انسان بھی عاشق بن سکتا ہو اور عشق کا منجمد سے منجمد مادہ بھی ہیجان میں آسکتا ہے ان گولیوں کے متعلق صرف اسقدر لکھدینا کافی ہو کہ ان کے اجزا میں سے ایک جز اتفاق سے قیس نے کھا لیا تھا جو مجنوں بن گیا

اور ایک فرہاد نے کھایا تھا جو کوہ کن کے نام سے زندۂ جاوید ہے
آج ہی آرڈر دیجئے ورنہ تازہ گولیاں بننے تک انتظار کی زحمت
برداشت کرنا پڑے گی۔ قیمت فی پیکٹ جس میں مکمل خوراک
دس گولیاں ہوں گی اور پرچہ ترکیب استعمال بھی ہمراہ ہوگا ۱۰/
محصول بذمہ خریدار فائدہ نہ ہو تو قیمت کے ہمراہ پچاس روپے
بطور جرمانہ واپس۔ ذیل کے پتہ پر آرڈر دیجئے۔
"حکیم مشکلکشا خاں۔ عمدۃ الحکما، مالک مشکل کشا میڈیکل ہال رودخانہ اسٹریٹ ملاہو"

اس اشتہار کو دیکھکر میرے دل نے گواہی دی کہ یہ اشتہار منجانب اللہ صرف میرے لئے دیا گیا ہے اور حکیم مشکل کشا خاں کو خداوند کریم نے صرف میری مشکل کشائی کے لئے پیدا کیا ہے میں نے بار بار اشتہار کا مضمون پڑھا اور ہر مرتبہ میرے دل پر اسکی صداقت کا اثر قائم ہوتا گیا یہاں تک کہ میں نے ایک کارڈ اُٹھاکر لکھ ہی دیا۔

مکرمی جناب حکیم صاحب۔ تسلیم۔ آپکا اشتہار رسالہ "ندرت" میں
نظر سے گزرا۔ براہ کرم اپنی عشق کی گولیوں کا ایک پیکٹ
مندرجۂ ذیل پتہ پر وی پی فرمادیجئے۔ شکر گزار ہوں گا۔
نیاز مند۔ عاشق حسین خاں
عاشق منزل نمبر ۴۲۵۔ اُلفت نگر۔ پریم گنج

خط لکھ چکنے اور سپرد ڈاک کرنے کے بعد ہی سے مجھکو اپنے میں ایک ایسی
تازگی اور چستی محسوس ہونے لگی گویا کسی بہت بڑے فرض سے سبکدوش
ہوگیا ہوں بلکہ بعض اوقات تو میں اپنے میں کچھ اس قسم کی گرمی محسوس کرتا تھا کہ
گویا محض گولیوں کا آرڈر دیدینے سے عشق پیدا ہوگیا ہے۔ سات آٹھ روز تک
میرا یہی عالم رہا اور اس دوران میں اپنی کیفیت کا خود ہی اندازہ کرنیکے بعد
میں اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ عشق تو خیر نہیں عشق کی صلاحیت پیدا ہو جائیگی معلوم نہیں
ظالم نے کونسا عمل پڑھکر اشتہار لکھا تھا کہ اسکے الفاظ تک میں بھی عشق کی گولیوں کی تاثیر تھی
بہرحال خدا خدا کرکے عین انتظار کے عالم میں ایک دن پوسٹمین نے ۱۵؍ کا
وی پی دیا ہم تو خود ہی ہر وقت وی پی کے دام ازاربند میں باندھے
پھرتے تھے فوراً قیمت ادا کرکے وی پی وصول کرلیا اور نہایت اضطراب
کے ساتھ پیکٹ کھول کر دیکھے تو گولیوں کی صورت دیکھی جو بالکل بکری کے
بچوں کی مینگنیوں کے برابر تھیں اور رنگ میں بھی ان ہی سے ملتی جلتی۔
لیکن یہ معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہر گولی کے اندر ایک دنیائے عشق آباد ہے
اور ہر گولی کیوپڈ کے کمان کا تیر نہیں بلکہ کیوپڈ کے ریوالور کا کارتوس ہے
ہم نے دس گولیوں کو بغور دیکھنے کے بعد ترکیب استعمال کا پرچہ نکالا جوکہ تھا
تو ایک ہی ورق لیکن دونوں طرف چھپا ہوا، ایک طرف تو تقریباً وہی
مضمون تھا جو اشتہار کی صورت میں ہم دیکھ چکے تھے اور دوسری طرف

ترکیب استعمال درج تھی جو من وعن درج ذیل ہے۔

اگر تم عاشق بننا چاہتے ہو تو آج ہی سے طے کر لو
کہ تم عاشق ہو اور دل میں اس کا پورا یقین کر لو کہ تم کو عشق ہو
اسکے بعد سہ پہر کو غروب آفتاب سے کچھ قبل غسل کرو آنکھوں میں
سرمہ لگاؤ صاف کپڑے پہن کر عطر لگاؤ سر میں خوشبودار تیل
ڈال کر تھوڑا سا پانی بھی ملا لو کنگھی سے بال سنوارو اور یہ
طے کر کے کہ تم اپنے محبوب کے پاس جا رہے ہو بسم اللہ کہکر
گھر سے نکلو لیکن گھر سے چلتے وقت ایک تولہ سرد پانی کے ہمراہ
ایک گولی کھا لو اور پھر خوشبودار پان کھا کر کسی پُرفضا مقام پر
یہ طے کئے ہوئے چلے جاؤ کہ وہاں تم کو تمھارا محبوب ملے گا
چنانچہ جس مرد یا عورت کو دیکھکر تمھارے دل میں پسندیدگی کا
جذبہ سب سے پہلے پیدا ہو اسکو تم اپنا محبوب سمجھنا اسی سے تم کو
عشق ہوگا اور دس دن کے اندر ہی اندر عشق اپنے تمام
مدارج طے کریگا۔ لیکن دس دن تک تم کو چاہیے کہ اپنے
محبوب کا تعاقب ضرور کرو اور اگر بہت زیادہ دشواریاں
ہوں تو کم سے کم ایک مرتبہ دیکھ ضرور لو اگر ان ترکیبوں پہ
عمل کر کے تم نے دس دن تک دس گولیاں ایک گولی

روزانہ کھائی تو تمھارے عاشق ہونے کی ذمہ داری ہم پر ہے
ورنہ ہم ذمہ دار نہیں۔

اگر اپنے محبوب کو مطیع بنانا چاہتے ہو تو اس عمل کو
یاد کرلو "میں عاشق ہوں میں عاشق ہوں میں تمھارا عاشق ہوں"
اور جب تم اپنے عشق کے ہاتھوں بالکل ہی بے قابو ہو جاؤ
اور یہ سمجھ لو کہ اب بغیر وصل یار کے زندگی محال ہے تو اسی عمل کو
اپنے محبوب کے سامنے اس طرح پڑھو کہ وہ اس کو بخوبی سن سکے
بلکہ اگر بار بار سنے تو زیادہ اچھا ہے۔

میں نے ترکیب استعمال کو بار بار پڑھا تاکہ خوب اچھی طرح سمجھ جاؤں اور
جب خوب سمجھ گیا تو اسکو عملی صورت میں لانے کے لئے اہتمام شروع کر دیے
غروب آفتاب میں تو ابھی بہت دیر تھی لیکن میں نے اس دیر کو غسل وغیرہ کے
اہتمام میں کسی نہ کسی طرح کاٹ دیا اور آخر کار حسب ہدایت غروب آفتاب سے
کچھ قبل نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر عطر سے معطر ہو کر اور کنگھی
چوٹی سے فارغ ہو کر دل میں یہ طے کر کے کہ محبوب کے پاس جا رہے ہیں
گھر سے اس طرح نکلے کہ ؂

کوچۂ یار میں اس ٹھاٹھ سے جاتا ہوں میں ~~~ شور ہر سمت اُٹھا مار چلا مار چلا

مگر اتفاق سے واقع ہوا ہے چوراہے پر جہاں سے چار سڑکیں

مختلف مقامات کو جاتی ہیں۔ ایک بوچڑخانہ کو، دوسری جیل کو، تیسری دریا کے
کنارے اور چوتھی سول لائنس کو، ہم نے سوچا کہ اگر بوچڑخانہ کی طرف گئے
تو کسی قصائی زادی سے عشق ہونا لازمی ہے اور اگر جیل کی طرف گئے تو
معشوق جرائم پیشہ ملے گا۔ دریا کے کنارے زیادہ سے زیادہ دھوبی یا ملاح کے
خاندان سے عشق کا رشتہ جوڑنا پڑے گا۔ لہذا سب سے بہتر یہی ہے کہ ٹھنڈی
سڑک سے ہوتے ہوئے سول لائنس کی طرف جائیں۔ بہت ممکن ہے کہ قسمت میں
کوئی مغربی بت طناز لکھا ہو لہذا بسم اللہ کہکر اسی طرف کو چل کھڑے ہوئے
راستے میں قدم قدم پر راہگیر ملتے تھے اور ہم ہر ایک کو اسلئے دیکھ لیتے تھے کہ
ممکن ہے ان ہی میں کوئی ہمارا مطلوب ہو لیکن دل میں پسندیدگی کا جذبہ
پیدا نہ ہوتا تھا آخر چلتے چلتے جب ہم ٹھنڈی سڑک سے سول لائنس کی طرف
مڑنے ہی والے تھے کہ دور سے آسمانی رنگ کی ریشمی ساری ہوا میں لہراتی
ہوئی نظر آئی اور اس ساری میں لپٹی ہوئی خاتون ہماری ہی طرف آتی
ہوئی دکھائی دی میں سمجھا کہ شاید کنواں خود پیاسے کے پاس آرہا ہے۔ ایک
دم سے چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ وہ خاتون ایک خوبصورت کشتی کی طرح اپنے
بادبان اڑاتی ہوئی مجھ سے قریب تر ہوتی گئی یہاں تک کہ [illegible] میں نے
اسکی صورت کو دیکھکر یہ غور کرنا شروع کیا کہ میں نے اسکو کہیں دیکھا
ضرور ہے۔ صورت پہچانی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی [illegible]

زور دینے کے بعد بھی مجھکو یاد نہ آیا کہ میں نے اسکو کہاں دیکھا ہے یہاں تک کہ وہ میرے نزدیک سے گزری اور مجھکو سلام بھی کیا۔ سلام کا جواب تو خیر میں نے غیر ارادی طور پر دیدیا لیکن اب مجھکو اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ صورت دیکھی بھالی ہے میرا دماغ اسی غور و فکر میں تھا۔ نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسی طرف کھنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں اسکے ایک ایک انداز کو اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ کوئی ایسی چیز ہو جسکو اب تک میں نے نہیں دیکھا۔ اسکی چال میں گنگنائی یا پائیاں تھیں وہ کبھی مجھکو ایک مست طاؤس نظر آتی تھی اور کبھی حسین ہرنی وہ اپنی ساری کو ہوا کی تیزی سے اُڑنے نہ دینے کی کوشش میں کبھی تو کامیاب ہو جاتی اور کبھی ناکام ہو کر عجیب منظر پیش کرتی تھی۔ ہرن کھری کا سفید جوتا اس کے نازک جسم کو اس طرح اُٹھائے ہوئے تھا کہ وہ سڑک پر اس رنگین حباب کی طرح تیرتی نظر آتی تھی جو موجوں کے دور میں بہا جا رہا ہو۔ میں تھوڑی دیر تک اس دلکش منظر کو دیکھتا رہا اور پھر غیر ارادی طور پر اسکے پیچھے ہو لیا تمام راستے میں اسی کو دیکھتا رہا لیکن جب وہ ایک کوٹھی کے احاطے میں تار بچا ند کر داخل ہو گئی تو مجھکو بھی یاد آیا کہ میں اسکے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اب وقت زیادہ آ چکا تھا لہذا میں بھی گھر آ گیا اور جب بستر پر لیٹا تو میرے دماغ میں سوائے اس سوال کے کوئی بات ہی نہ تھی کہ میرا محبوب کون ہے؟ دل نے کہا وہی خاتون! لیکن میں نے کہا استغفراللہ میرا اسکا کونسا جوڑ وہ ایک امیر کی

چھو کری اور میں نشن لینے کے قریب، لیکن اس کے علاوہ میرے دل و دماغ میں کسی کا خیال ہی نہ تھا۔ میں اسی غور و فکر میں بستر پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا کہ طبیعت مالش کرنے لگی اور باوجود الائچی اور پان وغیرہ کھانے کے ایسی زبردست قے ہوئی کہ پیٹ کی ایک ایک آنت کھنچ کر رہ گئی۔ میں سمجھا کہ مکھی کھا گیا ہوں لیکن یاد آیا کہ کھانا بھی تو نہیں کھایا ہے۔ پھر سوچا کہ کالرا ہوا ہوگا مگر پیٹ اب گیا تو خوب کھل کر ہو گیا۔ پھر ہم کو خود ہی یاد آ گیا کہ لاحول ولا قوۃ نہ مکھی کھائی ہے نہ کالرا ہوا ہے یہ تو سب علامتیں عشق کے مادے کے ہیجان میں آنے کی ہیں۔ گولیوں کے تیر بہدف اور زود اثر ہونے پر اعتقاد سا ہو گیا اور ہم قے آجانے کے بعد والی خستگی سے نڈھال ہو کر سو گئے۔ صبح کو طبیعت صاف تھی مگر کمزوری بدستور محسوس ہو رہی تھی جسکی وجہ ظاہر تھی کہ رات کو ایک تو کھانا نہیں کھایا اس پر قے ہو گئی حالانکہ اسوقت بھی کھانا دیکھ کر متلی آ رہی تھی لیکن زبردستی ایک آدھ لقمہ کھا کر آنیوالی شام کے انتظار میں بیٹھ گئے اور آفتاب کی رفتار کا اندازہ کرتے رہے۔ کبھی غسل کا پانی ٹب میں بھرتے تھے اور کبھی کپڑے نکال کر رکھتے تھے کبھی عطر کی شیشی اٹھا کر آئینے کے سامنے رکھ دیتے تھے اور کبھی تیل کی بوتل کے قریب تھوڑا سا پانی، اسی طرح خدا خدا کر کے پہاڑ سا دن کاٹا اور شام کو اسی طرح گھر سے گولی کھا کر نکلے اور ٹھنڈی سڑک پہونچے آج پھر وہ بیگم صاحبہ اسی انداز میں ٹہل رہی

ان کی غارتگری میں سوائے اسکے کوئی فرق نہ تھا کہ بجائے آسمانی کے کاسنی رنگ کی ساری پہنے تھیں میں نے لاکھ لاکھ ان کی طرف سے نظر ہٹانیکی کوشش کی لیکن جب سامنے سے گذرتے ہوئے انھوں نے ادب تسلیم کی تو مجھکو بھی آنکھیں چار کرکے جواب دینا پڑا اور اس کے بعد میں پھر اسی غور و فکر میں محو ہو گیا کہ یہ ہیں کون؟ اور میں نے ان کو یا انھوں نے مجھکو کہاں دیکھا ہو؟ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ہم اسی غور و فکر میں آج پھر اُن ہی کے ساتھ ہو لئے۔ ع

جن سے کچھ جان نہ پہچان بڑی مشکل ہو

اور کل کی طرح آج بھی سڑک کے ایک سرے پر وہ اور ایک سرے پر ہم چلتے رہے یہاں تک کہ وہ تاربجاند کر کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو گئیں اور ہم غریب خانے پر واپس آ گئے۔ آج بھی بھوک نہ تھی بلکہ طبیعت میں گرانی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں اس طرف سے بےفکر یہ طے کر رہا تھا کہ کیا واقعی یہی صاحبزادی میری محبوبہ ہیں؟ دلکو یقین نہ آتا تھا۔ لیکن واقعات یقین دلا رہے تھے آخر کار میں نے بھی کہا کہ اگر مشیت ایزدی یہی ہو تو کیا چارہ ظاہر ہو کہ عشق کا دیوتا اندھا ہو وہ کچھ نہیں دیکھتا کہ کس کا دامن کس کے ہاتھ میں دے رہا ہو نہ اُسکو سار و اجل کا خیال ہوتا ہو نہ دُنیا کے کسی بل کا وہ تو بس آنکھ بند کرکے تیر چلا دیتا ہو اب اُسکی بلا سے جیسے چاہے لگے۔ آج پھر طبیعت مالش کرنے لگی اور بجائے ایک کے دو مرتبہ قے ہوئی۔ بلکہ

تھوڑی دیر کے بعد دست بھی آیا لیکن مجھکو کوئی تشویش نہ تھی بلکہ میں عشق کے
مادّے کے ہیجان میں آنے سے خوش تھا. تیسرے دن بھی سب کچھ وہی ہوا جو
پہلے اور دوسرے دن ہوا تھا فرق صرف اسقدر تھا کہ اول تو میں نے
اس خاتون کو بجائے صاحبزادی کے براہ راست اپنی محبوبہ سمجھ کر دیکھا اور
ان کے سلام کا جواب بھی مسکرا کر دیا. دوسرے مجھکو قے بھی دو مرتبہ ہوئی
اور پاخانے بھی دو مرتبہ گیا. اب میرا روز کا یہ معمول ہو گیا کہ شام کو گولی
کھا کر ٹھنڈی سڑک جانا وہاں سے اپنی محبوبہ کے ہمراہ سڑک کو درمیان
چھوڑ کر ان ہی کے متوازی چل کر ان کو کوٹھی کے احاطے کے تاروں تک
پہونچانا. وہاں سے گھر لوٹ کر آنا دو ایک مرتبہ قے کرنا دو ایک مرتبہ پاخانے
جانا اور پھر نڈھال ہو کر سو رہنا. لیکن روز بروز میں اپنے میں ایک کمزوری
محسوس کر رہا تھا. غذا تقریبًا بالکل چھوٹ گئی تھی رنگ زرد ہو کر رہ گیا تھا
ہاتھ پیروں میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا. دوست احباب مریض بتاتے تھے
لیکن میں جانتا تھا کہ عشق کا مادّہ ہیجان پر ہے اور میں عاشق بن رہا ہوں
اس لئے مجھکو کوئی فکر نہ تھی. میری محبوبہ میرے دل و دماغ بلکہ تمام جسم میں سما چکی
تھی. اور مجھکو اب بغیر اس کے زندگی دشوار نظر آتی تھی. بارہا ارادہ کیا کہ
اب اس کہ مطیع کرنے والا عمل پڑھوں لیکن دل نے کہا ابھی کیا
جلدی ذرا مادّے کو اور ہیجان میں آنے دو لیکن آٹھویں دن تو میرا

بُرا حال تھا۔ اول تو کمزوری کی وجہ سے مجھکو اُمید نہ تھی کہ کل پھر آسکونگا دوسرے اب صبر کی تاب نہ تھی بمشکل تمام ضبط کیا اور طے کرلیا کہ کل عمل ضرور پڑھ کر اپنی قسمت کا فیصلہ کرلوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔"

میں نے عاشق حسین خاں کے عشق کی داستان سنا کر کہا نوین دن جو کچھ ہوا وہ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں، اب بتائیے کہ ان گولیوں کو کس طرح جھوٹا کہا جا سکتا ہے؟ سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر نقش حیرت بنے بیٹھے تھے قصے کے سچ ہونے کے لئے تحریری ثبوت موجود تھا اور گولیوں کے تیر بہدف ہونے کا ثبوت یہ قصہ تھا لیکن ناصر بھلا کب ماننے والے تھے تھوڑی دیر تک "انگشت حیرت در دہاں" نیچے درجن نیچے برجن کے بعد فرمایا اگر کوئی گولی بچی ہو تو مجھکو فوراً منگا دو میں اسکے اجزائے ترکیبی کو علٰحدہ علٰحدہ کرکے مشتہر صاحب کو بڑے گھر کی سیر کرادوں گا، مذاق نہیں ہے اس قسم کی دوائیں بنا لیں بدمعاش کہیں کے یہ لوگ ڈاکو ہیں ڈاکو

میں نے کہا اسمیں بڑے گھر کی سیر کرانیکی کونسی بات ہے کیا صرف اس لئے کہ ایک ہندوستانی نے ایسی چیز تیار کرلی جو یورپ میں نا پید تھی"

ناصر نے قابلیت کے ساتھ ہم کو سبق پڑھانے کے انداز میں کہا "بھائی تم لوگ طب نہیں جانتے تم کو کیا بتاؤں، تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ان گولیوں میں زہریلی چیزیں پڑی ہیں جو عشق مجازی تو خیر مجازی ہے

انسان کو خدا سے بھی واصل کر سکتی ہیں۔"

احمد نے طالبعلمانہ انداز سے کہا۔" لیکن زہر کا فعل یہ تو نہیں ہے کہ عشق پیدا کر دے۔ اور اگر زہر سے عشق ہو گیا تو خواہ وہ زہر ہو یا کچھ بہرحال حکیم مشکل کشا خاں کا مقصد پورا ہو گیا۔"

ناصر نے اسکو بیوقوف سمجھ کر جواب دیا۔" آپ ہیں صاحبزادے عزیز من! ان گولیوں میں دماغ کو ماؤف کرنے معدے کو خراب کرنے جگر کو تباہ کرنے اور دل کو کمزور کرنے کے ایسے ایسے زہر ہیں جو اچھے خاصے آدمی کو جان سے مار کر چھوڑیں۔ غریب عاشق حسین خاں کا دماغ اس حد تک بیکار کیا کہ وہ اپنے دوست کی لڑکی کو بھی نہ پہچانا افسوس یہ حکیم مشکل کشا خاں نے طبابت کی ہر یا موت کے فرشتے کے فرائض انجام دیے ہیں"۔

احمد اگر شامت آتی تو ان زہروں سے دماغ کے خراب ہونے کے بعد سہی مگر عشق ہی کیوں ہوا اور کچھ ہو جاتا۔"

ناصر نے" اونہہ" کہکر اسکی طرف سے رُخ بدل لیا اور مجھ سے کہا۔" حضرت آپ مجھ کو وہ گولی دیجیے، ضرور۔ پھر دیکھیے تماشا، حرام زادے، بے ایمان، دغاباز، مکار۔"

اب گویا مجکو اس مقدمے کی تفتیش بھی کرنا تھی اور عشق کی

گولی بھی حاصل کر کے ناصر کو پہونچانا تھی لیکن ناصر کے یہاں سے اٹھکر
جب شیطانی لشکر کچھ دُور نکل گیا تو سب نے ایک زبردست
قہقہہ لگایا کہ خوب گدھا بنایا۔ مگر طے یہی پایا کہ کل ایک بکری کی
مینگنی اِن لقمان وقت کو دیجائیگی۔ دیکھئے اس میں کون کون سے زہر
نکالتے ہیں اور کیا قابلیت بگھارتے ہیں۔"

منتخب ادبی جواہر پارے

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
جواہرات	۸ر	جذبات اوج	۸ر	ترانۂ شوق	۸عہ
لمعات صداقت	۴ر	دعوت حق	۸ر	آئینۂ حرم	۱۰ر
مکاتیب اکبر	عہ	رباعیات حافظ	۶ر	نگارستان (دینار)	۶عہ
قاسم و زہرا	۱۲ر	حضرت رشید	عہ	مینائے سخن	۸عہ
رباعیات خیام مترجم	۴عہ	نیرنگ جمال	۴ر	حیات انیس	۶عہ
گہوارۂ تمدن	۶عہ	مکاتیب محسن الملک	۸عہ	رباعیات حالی	۸ر
کسوف الشمسین	۴ر	جذبات بھاشا	۱۲ر	بدر کمال	عہ
بشریٰ	۶ر	گلکدہ	عہ	صنمخانۂ عشق	۶عہ
حیات سعدی (از حالی)	عہ	ایشیائی شاعری	عہ	عالم خیال	۸ر وعہ
نظم رنگین ادا	۶ر	قطعات حالی	۸ر	مکاتیب امیر مینائی	۶عہ
انتخاب مخزن ۳ جلد	للعہ	مرثیہ مرزا غالب	۱ر	شاہ سخن	۸عہ
کلیات وفا	۸عہ	ابنائی قربانیاں	۸ر	سفرنامۂ ہستی	۸عہ
بانگ درا	سے	خوبی سخن	۸ر	مثنوی گنجینہ	عہ
اخترستان	عہ	عود ہندی	عہ	دیوان حسرت ۲و۳و۴	۸عہ

نوٹ۔ اگر آپکو کتابوں کا شوق ہے تو ہماری فہرست طلب کیجئے۔

بہن ہمسائی

بہن ہمسائی

نہ ہم ان کے کوئی تھے اور نہ دنیا میں کوئی ان کا ہمدرد تھا۔ بس جو کچھ بھی تھیں بہن ہمسائی تھیں۔ وہی ان کی ہمدرد، وہی ان کی مونس وہی ان کی غمگسار اور وہی ان کی دکھ درد کی شریک، بس یہ سمجھ لیجئے کہ کچھ دنوں تک تو تعلقات کے ان بڑھتے ہوئے پینگوں کو ہم بیگم صاحبہ کی وہی حماقت سمجھتے رہے جو عام طور پر عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن ہم کو اطمینان تھا کہ عورتیں اس قسم کے تعلقات کو نباہنے میں کبھی وضعداری سے کام نہیں لیتی ہیں اور اسی طرح بیگم صاحبہ اور ان کی بہن ہمسائی میں بھی آج ہی کل میں تو تو میں میں ہو کر اس تمام بہناپے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن جب ہمارے انتظار کی کوئی حد ہی نہ رہی اور ہم نے یہ دیکھا کہ یہ دوستی تو بجائے گھٹنے کے روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے تو ہم کو بھی بیگم صاحبہ کی بہن ہمسائی سے خواہ مخواہ رقابت پیدا ہو گئی اور ہم اُن سے باقاعدہ طور پر جلنے لگے۔ لیکن ہم اپنی رقابت اور جلن کو ظاہر کرنا بھی مصلحتِ وقت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن موقع موقع سے ہمسائی کی جسٹر کاٹنے میں مصروف تھے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ آخر اس میں ہمارے جلنے کی کونسی بات تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ جلنے کی جو کچھ بات تھی اسکو ہم ہی سمجھ سکتے ہیں اور ہمارا ہی دل خوب جانتا ہے اب یہ بتائیے کہ ہم تو دفتر سے مرے تھکے خستہ نڈھال اس امید پر گھر آئے کہ بیگم کا ہنستا ہوا منہ دیکھکر بشاش ہو جائیں گے۔ تمام کلفت دور ہو جائے گی وہ گرمجوشی سے ہمارا خیر مقدم کرینگی اور ہم ان کی گرمجوشی کی داد محبت سے دیں گے۔ وہ ہم کو منہ دھونے کے لئے پانی دیں گی اور ہم منہ دھو کر تازہ ہو جائیں گے، وہ ہمارے لئے چاء منگائیں گی اور ہم ان کو بھی اپنے ساتھ چاء پلائیں گے لیکن گھر پر جو پہونچے تو معلوم ہوا کہ ہرتال ہے۔ تمام گھر میں سناٹا چھایا ہوا ہے پوچھا ملازمہ سے "ارے کہاں ہیں بیگم؟" جواب ملا "حضور ہیوی ہمسائی کے یہاں گئی ہیں!" بس جناب کچھ نہ پوچھئے کہ اس وقت کیا کیفیت ہوئی، معلوم یہ ہوا کہ ایک چنگاری پیروں سے اُٹھی اور سر پر آکر بجھی۔ طبیعت یکایک ایسی نڈھال ہو گئی کہ گویا تھوڑی ہی دیر کے مہمان ہیں۔ دل سے آک آہ کے ساتھ بددعا نکلی کہ اے خدا تو یا تو بہن ہمسائی کو اُٹھا لے یا ہم ہی کو موت دیدے اور پھر مری ہوئی آواز میں ملازمہ سے کہا "ذرا منہ دھونے کو پانی دو اور چاء لاؤ جب ہم منہ دھو کر چاء زہر مار کر چکے تو کھڑکی کھلی اور آپ اس طرح

تشریف لائیں گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ "ارے آپ آگئے"
جی ہیں تو آیا کہ جواب یہ دیں کہ "جی ہاں آ بھی گئے اور مر بھی چکے" مگر ہم نے
ضبط کر کے بیواؤں کے انداز سے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "جی ہاں"
ایک دن کا ذکر ہے کہ ہمیر بیوی کی پوری محبت طاری تھی اور وہ بھی
ہم کو واقعی خوش رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہر بات ہماری مرضی کے مطابق
ہو رہی تھی یہاں تک کہ ہسائی کا بھی ذکر نہ تھا اور اس طرف سے ہم خالی الذہن
تھے۔ مختصر یہ کہ ہماری وہ بادشاہوں والی کیفیت ہو گئی کہ بیوی سے
کہدیں کہ "جو مانگنا ہو مانگ، بتا کیا مانگتا ہے" لیکن پھر ہم نے بجائے اُنسے
کہنے کے خود ہی کہا "ارے بیگم تمہارا سوئٹر کوٹ کسقدر میلا ہو گیا ہے
اور تم نے کہا بھی نہیں" خلاف عادت کہنے لگیں "نہیں تو، ابھی تو
ایسا میلا نہیں ہے"۔ ہم نے اصرار کے ساتھ کہا "نہیں میلا ہو گیا ہے
اب دوسرا آئے گا" بولیں "ابھی کیا کیجئے گا لاکر پھر دیکھا جائے گا"
ہم نے بڑے آدمیوں کی طرح جواب دیا "نہیں نہیں آپ میرے
ہوتے ہوئے میلا سوئٹر نہیں پہن سکتیں" کہنے لگیں "اچھا آپکی خوشی"
اور ہم سہ پہر کو بازار پہنچ گئے کہ اپنی بیگم کے لئے بہتر سے بہتر اور
قیمتی سے قیمتی سوئٹر لائیں گے۔ تمام ہندوستانی اور انگریزی دکانیں
چھان ماریں اور ہر جگہ سینکڑوں قسم کے سوئٹر کوٹ دیکھنے کے بعد

ایک کا انتخاب کر کے خرید لیا جس کے متعلق ہماری یہ رائے تھی کہ شہر لکھنؤ میں شاید ہی کسی رئیس زادی کے پاس نکلے۔ ہم کو یقین تھا کہ اس سوئٹر کوٹ کو دیکھکر بیگم کی باچھیں کھل جائیں گی اور آج سے وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے ہماری ممنون ہو جائینگی اور واقعی وہ چیز تھی بھی ایسی ہی تھی کمبخت اگر لیڈیز سوئٹر کوٹ نہ ہوتا تو کبھی کبھی ہم خود بیگم سے مانگ کر پہن لیا کرتے لیکن ہمارے لئے یہی کیا کم تھا کہ "مسز ہماری" یہ سوئٹر کوٹ پہنیں گی اور ہم دیکھکر خوش ہوں گے جس محفل میں پہنکر جائیں گی۔ ہمارا نام ہوگا کہ فلاں صاحب کی بیگم ہیں۔ ہم ان ہی خوشگوار خیالات میں مستغرق گھر پہنچے اور زور دار آواز سے کہا "بیگم آؤ دیکھو تو سہی کہ میں بھی تمہارے لئے کیا چیز لے آیا ہوں" بیگم اٹھلاتی ہوئی آئیں اور ہمارے شانوں پر ہاتھ رکھکر کھڑی ہوگئیں ہم نے بکس کھول کر کہا دیکھا تم نے، پھر نہ کہنا کہ ہمارا میاں ہم کو نہیں چاہتا۔ سوئٹر کوٹ کے حسن سے مرعوب ہو کر بیگم نے ہنستے ہنستے کہا "اہاہا۔ مگر کتنے کا ہے؟" ہم نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "تم کو اس سے کیا مطلب کتنے ہی کا ہو تم تو مزے سے اس کو پہنو" مچلنے کے انداز سے اصرار کر کے کہنے لگیں "نہیں بتا دیجئے کہ کتنے کا ہے" آخر ہم نے کہا "پھر وہی آخر تم قیمت معلوم کر کے کیا کرو گی تم اس کو

مگر ہم نے انتہائی ضبط سے کام لیکر کہا "اچھا دکھا دیجئے" اور وہ
زنانے کے ساتھ کھڑکی کھول کر ہماری رقیبہ کے یہاں پہونچ گئیں
اسکے بعد جو کچھ ہوا واللہ اسکا وہم و گمان بھی نہ تھا یعنی بیگم وہاں سے
ہنستی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں "بڑے وہ ہیں آپ بھی" ہم نے
حیرت سے کہا "کیا؟" کہنے لگیں "کہہ دیا پچپن روپے آٹھ آنے کا ہے"
ہم نے کہا "اور؟" کہنے لگیں "اور بہن ہمسائی کی کہتی ہیں کہ
ان کی بھانجی کے دیور اپنی بیوی کے لئے ایسا ہی سوئٹر کوٹ پٹیال
چھ روپے چار آنے کا لائے تھے اور وہ ایسا کمزور تھا کہ دو ہی دن میں
تار تار ہو گیا تو میں کیا کروں گی ایسا لے کر" ہم نے ضبط کرنیکی
کوشش کیے بغیر کہہ دیا "بہن ہمسائی سے آپ کی بھانجی کے دیور کی
بیوی کو کبھی ایسا سوئٹر کوٹ نصیب ہوا ہے! میں تو کہتا ہوں کہ اگر
کوئی صرف اسکا فوٹو ہی لاکر دیدے کہ میں لا دے تو غلامی کا خط
لکھتا ہوں؟" انھوں نے ہمارے اس غصہ کو محسوس کرتے ہوئے
کہا "اچھا تو رہنے دیجئے آپ نے دھوکا کھایا ہوگا" ہم نے کہا
"جی نہیں بس اب یہ واپس کر دیا جائے گا" اور یہ کہکر ہم کھٹ پٹ
کھٹ پٹ کرتے ہوئے [illegible] کی طرح گھر سے باہر نکلے اور بازار سے دوکان
پر پہونچکر یہ سوئٹر کوٹ واپس کر دیا۔ وہاں سے گھر آ کر [illegible]

ہاتھ میں رکھے اور کہا کہ "تم ہمسائی کی بھانجی کے دیور سے منگا لو میں اب نہ لاؤں گا" بیگم تو خیر اس واقعہ سے متأثر نہ تھیں لیکن ہمارا یہ حال تھا کہ گویا ایک بنا بنایا قلعہ ڈھا کر بیٹھے ہیں اور غنیم یعنی اسی ہمسائی نے ہم کو پسپا کر دیا ہے۔ اب سچ بتائیے کہ ہمسائی کے متعلق ہماری کیا رائے ہو سکتی تھی اور ہمارا ہمسائی سے جلنا کہاں تک حق بجانب تھا۔

کہاں تک ہمسائی کے کرم ہائے بے پایاں کا ذکر کیا جائے لیکن اس خیال سے کہ کوئی ہماری زیادتی نہ سمجھے۔ ہم ایک واقعہ اور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نصیب دشمناں برخوردار نور چشم سلمہ کی طبیعت خراب تھی اور ماں کے برابر نہ سہی لیکن پھر بھی چونکہ ہم باپ ہیں ہم کو بھی سخت فکر تھی لیکن کرتے تو کیا کرتے بس یہی کر سکتے تھے کہ یونانی علاج کیا جب اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو ڈاکٹری علاج شروع کر دیا اسکو بھی چھوڑا تو ہومیو پیتھک دوا دینے لگے لیکن کسی علاج سے کوئی فائدہ ہی نہ ہوتا تھا اور ہمارا رات بھر تیمار داری کرنے میں یعنی بہلانے اور سلانے کی کوشش کرنے میں اور دن بھر حکیموں اور ڈاکٹروں کے گھروں کے سو سو چکر لگانے میں وقت گزرنے لگا لیکن اسکے باوجود بیگم صاحبہ کے یہ تیور تھے کہ گویا ہم نے ان کے بچے کو بیمار ڈالا ہے اور اب

ہم ہی اُسکی طرف سے لاپروائی برت رہے ہیں وہ زبان سے تو
خیر کچھ نہ کہتی تھیں لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں کھائے جاتی تھیں
بہرحال ہم کو اسکی تو پرواہ بھی نہیں۔ البتہ ہم کو یہ ضرور بُرا معلوم ہوتا تھا کہ
ایک تو بچہ کی علالت کی فکر اُسپر سے بیگم صاحبہ کی قہرمانیت۔ پھر بھی
ہم نے کبھی اس سلسلہ میں بیگم سے اُلجھنے کی کوشش نہ کی۔ اسلئے کہ
ہم ان کو بھڑ کا چھتہ سمجھنے لگے تھے اور اسی میں بات بڑھ رہی تھی
ورنہ صفائی ہو جاتی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ تو کہئے کہ ایک دن
ہم نے اُن سے کہا کہ "آج سول سرجن کو لاتا ہوں" اسکا جواب
انھوں نے اپنے اُسی بھولے پن سے دیا "نہ لائیے گا"
ہم نے پوچھا "کیوں؟" کہنے لگیں "یونہی" ہم نے کہا "صاف صاف
کہو" بولیں "کہہ تو دیا" اب ہم عجیب شش و پنج میں تھے کہ
کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ تھوڑی دیر ہم نے اس مبحث ہی کو
ٹال دیا۔ لیکن جب باوجود انتہائی غور و فکر کے ہم اس نتیجہ پر
پہونچے کہ سول سرجن کو دکھانا ضروری ہے تو ہم نے پھر سنبھلتے
ہوئے بیگم سے کہا "آپ سول سرجن کو لانے کے لئے کیوں منع
کر رہی ہیں؟" انھوں نے پھر وہی مہمل جواب دیا۔ "یوں ہی"
ہم نے اس جواب پر عاجز آکر پہلے تو ارادہ کیا کہ سر پیٹ لیں

پھر سوچا کہ بھاگ جائیں۔ پھر خیال آیا کہ کپڑے نوچ ڈالیں۔ آخر ہم نے
گڑگڑا کر کہا " اے بیگم خدا کے لئے رسول کے واسطے صاف
صاف کہو تم کیا کہہ رہی ہو ورنہ میرا دماغ اُلٹ جائے گا۔" اب
اُنھوں نے بھی یہ فیصلہ کرلیا کہ جو کچھ دل میں ہو کہہ ڈالیں گی۔ پھر چاہے
جو کچھ بھی ہو چنانچہ کہنے لگیں: " آپ کو خود نہیں معلوم ہے کہ سول سرجن کو
لانے کے لئے کیوں منع کر رہی ہوں۔ آئندہ اگر اسکی ایسی ہی پرواہ
تھی اور اس کا ایسا ہی خیال تھا تو پہلے ہی کیوں نہ وہ پٹی ڈھونڈوا کر
منگائی جو آج یہ نوبت نہ آتی" ہم نے کہا "کونسی پٹی" کہنے لگیں۔
"وہی وہی جو اس دن ہمسائی آکر بتا گئی تھیں۔" ہم نے جھلا کر کہا۔
"ہشت" کہنے لگیں " اور کیا آپنے تو ہشت کردیا اور سب [illegible]
بالکل۔ ابھی آج ہی بہن ہمسائی اس کو دیکھنے آئی تھیں اور کہہ رہی
تھیں کہ اس معصوم کو جان بوجھ کر مارا جا رہا ہے۔ اس کو کسی
علاج سے فائدہ ہی نہیں ہو سکتا۔ چاہے سول سرجن کا علاج ہو
یا کسی افلاطون کے بچے کا۔ ہاں اگر اب بھی وہ پٹی آجائے تو
پٹی بچاتے ہوئے یہ سینہ کی خرخراہٹ اور پسلی کا چلنا سب
ٹھیک ہو سکتا ہے" انشاءاللہ دل تو یہ چاہا کہ اپنی پستول سے
[illegible] اور اس [illegible]

کر کے پھانسی پر چڑھ جائیں۔ لیکن کیا کرتے مجبور تھے کہ بچہ بیمار پڑا تھا
اسوقت ہنگامہ برپا کرنا مناسب نہ تھا۔ لہذا انہایت خاموشی کے ساتھ ذلت
پیتے ہوئے باہر چلے گئے اور ان لقمان کی صاحبزادی ہمسائی کی بتائی
ہوئی بوٹی لانے کے لئے نوکر کو بھیج دیا۔ اس بوٹی نے جو اثر دکھایا وہ
ظاہر ہے کہ ہم کو آخر کار رسول سرجن کو بلانا پڑا وہ تو کہئے کہ بچہ کی
زندگی تھی بچ گیا ورنہ یہ طے تھا کہ اس ڈائن ہمسائی کو جہنم ہی واصل
کر کے چھوڑتے۔

یہی وہ واقعات ہیں جنھوں نے ہماری بیوی کی ہمسائی کو
ہمارے لئے عذاب کا فرشتہ بنا دیا ہے کہ جہاں اُن کا نام آیا اور ہم
اندر ہی اندر ایک خاموش آگ میں جلنے لگے۔ لیکن اب تو یہ حال
ہو گیا ہے کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے لیکن ہم نے بھی وہ ترکیب
نکالی ہے کہ یاد کریں گی بیگم صاحبہ اور ان کی ہمسائی دونوں۔
وہ ترکیب یہ ہے کہ مکاندار کو اسپر راضی کر لیا ہے کہ وہ ہم پر
اس گھر کو خالی کرانے کی نالش دائر کر دے اور اسکی وجہ
یہ بتائے کہ اس مکان کے مکاندار ہیں اور خود اُس کی
ضرورت ہو گئی ہے۔ لہذا وہ چاہتا ہو کہ گھر کو چھوڑ دے ظاہر ہے کہ
اس [illegible] بیگم صاحبہ آسانی کے ساتھ قبول کر لیں گی اور [illegible]

ان کی وجہ سے مکاندار کے اس مطالبہ کی خلاف کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں ہم نے مکاندار کو خوب اچھی طرح سکھا پڑھا دیا ہے کہ میرے بھائی تم نہایت سخت الفاظ کے ساتھ نوٹس دینا کہ مکان پندرہ دن کے اندر خالی کردو۔ اول تو مکان خالی نہوگا اور اگر ہم کو مکان خالی بھی کرنا پڑا تو تمہارے مکان میں اپنے سے پانچ روپیہ زیادہ دینے والا کرایہ دار دلوادیں گے۔

اب دُعا فرمائیے کہ یہ کوشش کامیاب ہو اور اس طرح ان بہن ہمسائی صاحبہ سے نجات حاصل ہو۔ اسطرف سے اطمینان رکھئے کہ اب جو ہم نے مکان تلاش کیا ہے اسکے چاروں طرف کوئی مکان نہیں ہے۔ لہذا کسی جدید بہن ہمسائی کے پیدا ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ لگے ہاتھ یہ بھی سُن لیجئے کہ اگر خدانخواستہ ہماری یہ آخری کوشش ناکام ہوئی تو یہ بھی طے ہے کہ یا تو ہماری موت بہن ہمسائی کے ہاتھوں آئے گی یا بہن ہمسائی کی موت ہمارے ہاتھوں۔ اب ہم اور ہماری بیوی کی بہن ہمسائی دونوں اس دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ یا تو وہی رہیں گی۔ اور یا ہم ہی رہیں گے۔
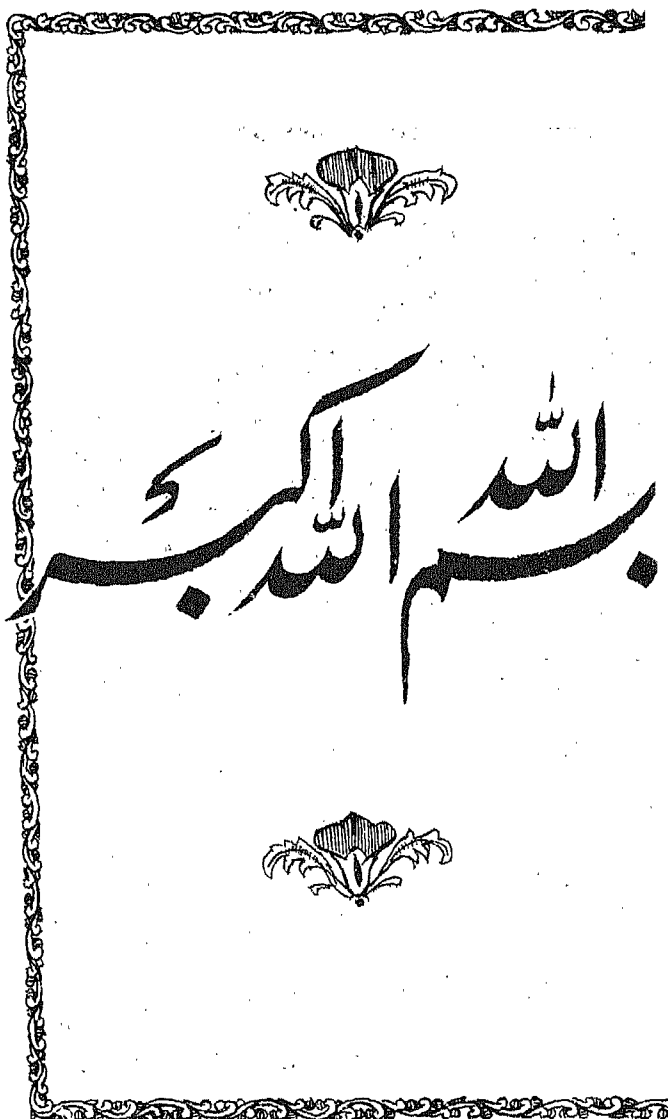
بسم اللہ اللہ اکبر

بسم اللہ اللہ اکبر

چوہیا کو دُم پکڑ کر قیمہ کی مشین میں ڈال دیا اور ہینڈل گھما کر نہایت نفیس کبابوں کا قیمہ تیار کر لیا۔ لیکن یہ اسوقت کا ذکر ہے جب ہم معلم الملکوت کے اُستادِ معظم تھے اور ہماری ہر شرارت کو ہمارے بزرگ بچپن کہا کرتے تھے اس کے بعد سے تو یہ حال ہوا کہ جسقدر عمر بڑھتی گئی بزدلی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے واسطے کسی ختنہ کی تقریب میں شرکت یا لڑکیوں کے کان چھیدنے کا نظارہ بھی قیامت ہو گیا اور رفتہ رفتہ ہم اس قوم کے فرد بن گئے جو تیغوں کے سایہ میں پل کر جوان ہوتا ہے۔ لیکن بندوق بلا لائسنس نہیں رکھ سکتا۔ تنکا رہم نے کبھی نہیں کھیلا۔ مُرغ یا کسی پرند کو ذبح کرنے کا ہم کو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ علم جرّاحی سے ہم کو کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی پھر بھلا ہم سے یہ کیونکر ممکن تھا کہ بقرعید کے دن اپنے ہاتھوں سے بکرا ذبح کرتے۔ لیکن بات کچھ ایسی آپڑی تھی کہ اگر ذبح نہیں کرتے تھے تو مردانگی میں فرق آیا جاتا تھا۔ اور ذبح کرتے تو کیسے کرتے جبکہ اس خیال سے بھی پسینہ آجاتا تھا عجیب کش مکش

میں پڑے ہوئے تھے کہ بیگم نے کہا:۔

" ایسا بھی کیا کوئی مرد ہو جو ایک معمولی سا بکرا بھی ذبح نہ کر سکے"

ہم نے تن کر جواب دیا۔

" اجی بکرا ؟ بکرے کی کیا حقیقت ہے ؟ مجھ سے کہئے تو میں ہاتھی ذبح کر دوں ؟"

منہ چڑھا کر کہنے لگیں۔

" جی ہاں۔ بجا ہے ، ہاتھی ذبح کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں"

اب آپ ہی بتائیے کہ اس تمسخر کے بعد ہم کو کسقدر اشتعال پیدا ہو سکتا تھا، واللہ دل تو یہ چاہا کہ اسی وقت ایک چھری اُٹھا کر تمام دُنیا کے بکروں اور بکریوں کو ذبح کر کے ڈالدیں۔ لیکن ہم نے ضبط سے کام لیا اسلئے کہ اگر مشتعل ہو جاتے تو بیگم کی وکیلوں والی چال کامیاب ہو جاتی۔ ہم نے بیگم کے تمام طعن و تشنیع کا خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ اور اس غیر دلچسپ بحث کو ٹال کر وہاں سے ٹل گئے۔

ابھی وقت بھی کافی تھا۔ اس معرکے کے لئے پوری رات پڑی تھی۔ لیکن بیگم یہ چاہتی تھیں کہ کل کی قربانی کے لئے آج ہی ہم سے وعدہ لے لیں تاکہ سال گذشتہ کی طرح عین موقع پر ہم فرار نہ ہو جائیں۔ اسی لیے

یہ بحث بارہ گھنٹہ قبل چھڑ گیا۔ اور ہماری تمام رات اس اُلجھن میں یا تو جاگ کر کٹی ورنہ جہاں آنکھ جھپکی نہایت خوفناک خواب دیکھے، ایک مرتبہ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لق و دق صحرا ہے نہ آدمی نہ آدم زاد بس ہم تھے یا خدا کی ذات کہ ایک طرف سے ہاتھی کے برابر بکرا ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہم بھاگے لیکن بکرے نے ہم کو پکڑ لیا اور بجائے "میں میں" کرنے کے بالکل انسانوں کی طرح نہایت سلیس اردو میں کہا "بھاگتا ہے؟ بھاگ کر کہاں جائے گا؟ تجھکو معلوم نہیں کہ تو بکروں کی دُنیا میں ہے اور ہمارے یہاں انسانی عید ہے۔ ہم تجھکو قربان کر کے ثواب بھی لوٹیں گے اور کباب بھی کھائیں گے۔" ہم بید کی طرح لرزنے لگے اور بمشکل ہکلا ہکلا کر اور غیر ارادی طور پر ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور بکرے صاحب ہم آپکے غلام ہیں جو چاہے کیجئے آپ اشرف المخلوقات ہیں۔ لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ اگر آپ نے ہماری جان بخشدی تو آپکو قربانی سے زیادہ ثواب ہوگا اور میں زندگی بھر آپکا خادم رہوں گا۔" بکرے نے اپنی داڑھی ہلائی اور بان جا کر جسکو ہم لوگ جگالی کرنا کہتے ہیں کہا۔ "اچھا اب اپنی منطق نہ چھانٹو چپکے سے ہمارے ساتھ چلے آؤ اور ہم تمکو جنت روانہ کر دیں۔" ہم برابر تھر تھرا رہے تھے اور منہ سے

آواز نہیں نکلتی تھی ہم کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اس ظالم بکرے نے ہم کو گرا کر اس طرح منہ میں دبا لیا جس طرح بلّی اپنے بچوں کو دبا لیتی ہے یا چوہے کو پکڑ کر بھاگتی ہے۔ ہم نے بہت کچھ ہاتھ پیر پھیلائے لیکن سب بیکار وہ ظالم بکرا جیسے کچھ سنتا ہی نہ تھا اُس نے ہم کو لیجا کر ایسی جگہ منہ سے چھوڑا جہاں اُسی کے برابر سیکڑوں بکرے تھے اور ہماری طرح کے بہت سے انسان کھونٹوں سے بندھے کھڑے تھے۔ ہم کو بھی ایک کھونٹے سے باندھ کر کھڑا کر دیا گیا اور سامنے کچھ تھوڑا سا چارہ ڈال کر ایک طشت میں پانی رکھدیا۔ ہمارا مالک بکرا ہم کو باندھ کر اور ہمارے کھانے پینے کا انتظام کر کے چلدیا۔۔۔۔ ہم بندھے ہوئے کھڑے تھے اور اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے تھے۔ کبھی بال بچوں کی یاد ستاتی تھی اور کبھی قربانی کے خوفناک تصور سے خون خشک ہو جاتا تھا۔ لیکن ۔ "موت آتی تھی پر نہ آتی تھی"

سر پر قضا منڈلا رہی تھی آنکھوں میں چھُری پھر رہی تھی اور ایک عجیب عالم تھا عجیب کیا بس، یہ سمجھ لیجئے کہ وہی عالم ہمپر گذر رہا تھا جو قربانی کے بکرے پر گذرتا ہوگا۔ ہم نے اپنے قریب بندھے ہوئے دوسرے آدمیوں کو مخاطب کرنا چاہا لیکن ان کو بھی رونے گڑگڑانے اور دُعائیں مانگنے سے فرصت نہ تھی لیکن ہم نے اپنے ایک ہمنوا کو مخاطب کر ہی لیا۔

"آپ ہی کچھ فرمایئے کہ اب کیا کریں"

بڑے میاں نے بالکل بکروں کی ایسی بھرائی ہوئی آواز نکال کر کہا۔ "خدا کو یاد کرو۔" اور پھر دعائیں مصروف ہو گئے۔ ہم نے بھی دعائیں کرنا شروع کر دیں۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ ظالم بکرا ایک لمبی چوڑی چھری اپنے پیروں میں سے ایک کے کھر میں لئے ہوئے آتا نظر آیا۔ اور ہم نے اسکو دیکھتے ہی بدحواس ہو کر اُچھلنا کودنا شروع کیا چیخنے چلانے لیکن اس ظالم نے ذرا بھی رحم نہ کھایا اور آتے ہی کھونٹے سے کھول کر ہم کو چاروں شانے چت زمین پر گرا دیا۔ ہم ایکدم سے چونک پڑے آنکھ کھل گئی گھڑی دو بجا رہی تھی اور لیمپ کی دھیمی روشنی غالباً بکرے کا افسانہ خاموش کہہ رہی تھی ہمارا دل دھڑک رہا تھا اور پسینہ سے تمام جسم تر تھا۔ ابھی اس کیفیت کو مشکل سے چند منٹ گذرے ہوں گے کہ رات کے سناٹے میں بکرے کی دلخراش آواز کچھ اس طرح ہمارے کانوں میں آئی کہ ہم اُچھل پڑے۔ ارادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں دیر ہے لاؤ چپکے سے بھاگ چلیں پھر دل نے کہا کہ لاحول ولاقوۃ یہ فرار تو گویا اعتراف بزدلی ہوگا خصوصیت سے ایسی حالت میں جبکہ ہم کو معلوم تھا کہ۔

"نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد"

ہم نے اپنے دلکو مضبوط کرنے کی کوششیں شروع کردیں اپنے آبا و اجداد کی بہادری کے افسانے دل ہی دل میں دُھرانے لگے ہمارے ہی رشتہ کے ایک دادا تھے جنھوں نے شیر کے جبڑے میں ہاتھ ڈال کر جبڑا پھاڑ دیا تھا۔ اور نانا جان مرحوم کا تو یہ قصہ بچہ بچہ کی زبان پر ہے کہ بھینس کی پیٹھ پر جو گھونسہ رسید کیا تو وہ بیچ سے دو ہو کر گر پڑی اسکے علاوہ ایک اور کوئی ہمارے بزرگ گذرے ہیں جنھوں نے پچاس مسلح ڈاکوؤں کا تنہا مقابلہ کیا تھا اور ایسا مقابلہ کہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا ان خاندانی روایات نے دل کو تقویت پہونچائی اور ہم نے بہادری کو اپنی خاندانی خصوصیت سمجھکر اپنے کو بھی نجیب الطرفین بہادر سمجھ لیا۔ ہم اِن خیالات میں محو تھے کہ آخر حصۂ شب کی خواب آور ہوا کا ایک ایسا خنک جھونکا آیا کہ ہماری آنکھیں بند ہوگئیں۔ آنکھیں بند ہی ہوئی تھیں کہ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک قوس قزح کے برابر ہلال کی طرح خمیدہ چھُری آنکھوں کو اپنی چمک سے خیرہ کرتی ہوئی ہماری طرف آرہی ہے ہم جوتے چھوڑ کر بھاگے اور سر پٹ بھاگتے رہے آگے آگے ہم تھے اور پیچھے پیچھے وہی چھُری کہ یکایک ایک سُرخ رنگ کے دریا کے کنارے ہم کو ٹھہر جانا پڑا غور سے جو دیکھا تو وہ دریا خون کا تھا۔ ہم سوائے ٹھہر جانے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے لیکن اب تو وہ چھری ہم سے اسقدر قریب تھی کہ پلک جھپکی اور گردن صاف

لہذا ہم موت کو برحق سمجھکر چھم سے اُس دریائے خون میں کود پڑے ....
ایک جھٹکے کے ساتھ ہماری آنکھ کھل گئی اسوقت بھی ہم پسینہ میں غرق تھے
اور معلوم ہورہا تھا کہ واقعی چھری نے ہمارا تعاقب کیا ہو سانس پھولی ہوئی
تھی اور دل کی دھڑکن پنجاب میل بنی ہوئی تھی ہم نے لاحول پڑھکر پسینہ
خشک کیا اور کلمہ پڑھتے ہوئے اُٹھکر بیٹھ گئے اس لئے کہ صبح قریب تھی
ایک جانور "ککڑوں کوں" کی صدائیں بلند کرکے ہم کو نماز یاد دلا رہا تھا چنانچہ
مرغ سحر کی اذان سے ہمکو نماز پڑھنے کا خیال آیا۔ وضو کیا اور ایک سچے
مسلمان کی طرح نماز پڑھکر دُعا مانگی کہ اے عزت دینے والے اور اے
آبرو کے مالک تو ہی اس قربانی کے امتحان میں ثابت قدم رکھے گا تو ہم
سرخرو ہوسکیں گے ورنہ ایک عورت کی نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
ذلیل ہوکر رہ جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ نماز اور دُعا کے بعد دل سے
ایک بوجھ سا اُتر گیا اور ہم خود بخود کچھ مطمئن سے ہو گئے۔ گھر میں بھی
سب جاگ چکے تھے کچھ نہا دھو رہے تھے اور جو نہا چکے تھے وہ کپڑے
تبدیل کررہے تھے بہرحال گھر میں تہواری فضائیں پیدا ہو چکی تھیں ایک
ہم تھے جو افیونیوں کی طرح قربانی کی پینک میں "غش" تھے کہ بیگم نے
بھونچال کی طرح کمرہ میں آکر زنّاٹے سے کہا۔ "ارے آپ نہائے نہیں؟"
ہم نے چونک کر کہا۔ "نہیں ابھی تو نہیں نہایا۔"

کہنے لگیں ۔" تو اب کب نہائیے گا معلوم بھی ہو بقرعید کی نماز جلدی ہوتی ہو"
ہم نے ٹرنک سے کپڑے نکالتے ہوئے کہا " غسل خانہ خالی ہو؟"
کہنے لگیں ۔ "جی ہاں خالی ہو جائیے نہا دھو لیجیے قربانی میں دیر ہو رہی ہو"
بس ظالم نے قربانی کا ذکر کر کے تمام حوصلے پست کر دیے لیکن ہم نے
نہایت مضبوطی کے ساتھ کہا " جلدی ہی کیا ہے"
آنکھیں نکال کر کہنے لگیں " جلدی ہی کیا ہو یعنی سات بجنے کو ہیں اگر
گوشت جلدی نہ ملا تو کس طرح کھانا جلدی تیار ہو گا جائیے نہا دھو کر
قربانی سے پہلے تو نماز بھی پڑھنا ہو ۔"

پھر وہی قربانی کا ذکر اور ہماری وحشت لیکن ہم نے اپنے اضطراب کو
بمشکل چھپانے کی کوشش کی اور کپڑے لیکر غسل خانہ میں گھس گئے ۔
نہا دھو کر عید گاہ پہونچے ۔ عید کی نماز بھی ایک سچے مسلمان کی طرح
ادا کی اور ہنسی خوشی عید ملتے ہوئے گھر کو روانہ ہوئے جیسے ہم کو
قربانی کرنا ہی نہ تھی لیکن گھر کے قریب پہونچکر دور سے دیکھتے ہیں تو
سامنے ہی بڑ قصاب بیٹھا چھریاں تیز کر رہا تھا دل نے کہا کہ ابھی
موقع ہے کھسک جاؤ اور ہم نے بھی ارادہ کر لیا تھا ۔ لیکن عین اسیوقت
اس بڑ قصاب نے ہم کو دیکھ لیا اور جھک کر سلام کیا ۔ اب بھاگنا ذرا
خودداری کے خلاف تھا ۔ لہذا ہم سنبھل گئے اور اکڑتے ہوئے

گھر تک پہونچے۔ بیگم چلمن سے جھانک رہی تھیں غالباً ہماری ہی منتظر ہونگی ہم کو دیکھتے ہی کہنے لگیں "ادھر آئیے ایک بات سن لیجئے" ہم تعمیل ارشاد میں حواس باختہ ان کے پاس پہونچے انھوں نے اتنی سی دیر میں کہ ہم عیدگاہ گئے اور نماز پڑھی نہ صرف بڑے قصاب کو بلا لیا تھا بلکہ انجمن عالیہ اسلامیہ ایک آنہ فنڈ کا وہ مطبوعہ اشتہار بھی منگا لیا تھا جسمیں مساجد کی مرمت کی اپیل تھی اور قربانی کی کھالوں کا مطالبہ اور اسی کے ساتھ قربانی کی دعا بھی لکھی ہوئی تھی بیگم نے وہ اشتہار دیتے ہوئے کہا "لیجئے اسکو پڑھکر جلد ہی سے قربانی کر دیجئے بڑی دیر ہو رہی ہے"

ہم نے وہ اشتہار اس طرح لیا گویا وارنٹ گرفتاری بلکہ پھانسی کا تحریری حکم اور مری ہوئی چال سے پہونچے اُس ظالم قصائی کے پاس جو چھریوں سے بیٹھا کھیل رہا تھا، اُسنے ہم کو تیار دیکھکر بکرے کو کھونٹے سے کھولا اور ہم کو ایک چھری پکڑا دی، یہ چھری بالکل معمولی سی تھی یعنی نہ بہت لمبی چوڑی نہ بہت زیادہ وزنی لیکن نہیں معلوم کیا بات تھی کہ ہمارے ہاتھوں میں ایک قسم کا رعشہ پیدا ہو گیا اور چھری ہماری گرفت سے نکلی جاتی تھی۔ قصائی نے ہمکو بیوقوفوں کی طرح کھڑے ہوئے دیکھکر کہا "پڑھئے دُعا" اور ہم نے اسکے حکم کی اس فرمانبرداری کے ساتھ تعمیل کی گویا وہ ہمارا کبھی وقت کا اُستاد ہی تو تھا۔ خدا جانے ہم نے مساجد کی

مرمت والی اپیل پڑھی یا قربانی کی کھالوں کا مطالبہ، بہرحال یہ تو اچھی طرح یاد ہے کہ اس گھبراہٹ کے موقع پر ہم سے دُعا کی عربی عبارت نہیں پڑھی گئی تھی اور نہ ہجے کرنے کا موقع تھا، ہم تو خدا جانے کبتک اس اشتہار پر نظریں جمائے کھڑے رہتے لیکن جب قصائی نے تقاضے کے طور پر پوچھا کہ "پڑھ چکے؟" تو ہم کو بھی مجبوراً گردن ہلا کر "ہوں" کہدینا پڑا۔ یہ سنتے ہی وہ ظالم بکرے کی طرف کچھ اس طرح جھپٹا کہ ہمارا ہاتھوں والا رعشہ برقی رو کی طرح تمام جسم میں پھیلتا ہوا شریانوں تک پہونچ گیا اور چھری بھی کچھ اس طرح ہمارے ہاتھوں میں گت ناچنے لگی کہ گویا ہم دانستہ اسکو نچا رہے تھے۔ قصائی نے بکرے کے ہاتھ پیر یعنی چاروں ٹانگیں پکڑ کر دھم سے گرا دیا اور ہم گرتے گرتے بچے اُسنے اپنا چارخانے والا سُرخ رومال کندھے سے اُتار کر بکری کی آنکھوں پر ڈالدیا۔ حالانکہ اسکو ہماری آنکھوں پر پٹی باندھنا چاہئے تھی لیکن ہم نے سوچا کہ ہم منہ پھیر لیں گے۔ قصائی نے کہا "کیجئے بسم اللہ اللہ اکبر" ہم نے کہا "کیا؟" کہنے لگا "حضور بس اب قربانی کیجئے بسم اللہ اللہ اکبر" ہم نے ذرا رعشہ کو دُور کرنے کی کوشش میں رعشہ کو اور بھی بڑھا کر نہایت معصومیت سے پوچھا۔ "پھیر دیں چھُری؟" اس نے کہا "میاں کہہ تو رہا ہوں پھیریئے نا۔"

بسم اللہ اللہ اکبر" چھری ہمارے ہاتھ سے گر پڑی اور ہم نے
اِدھر اُدھر دیکھکر جلدی سے تین چار مرتبہ اُٹھانے کی کوشش کرنیکے بعد
اسکو اُٹھالیا اور از سر نو اپنے کو قربانی کے لئے تیار کرنے لگے
بیگم نے چلمن کے پیچھے ہی سے کہا" آپ کیا کر رہے ہیں؟ جلدی
سے چھری پھیر کر چھٹی کیجئے۔" ہم نے اپنی دل مضبوط کر کے منہ ادھر
پھیر ادر چھری اُدھر چلائی قصائی نے کہا" بسم اللہ اللہ اکبر میاں
ادھر ارے میاں ادھر" ہم پھر سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ قصائی
نے ہمارا منہ دیکھکر کہا۔" حضور ڈرنے کی کوئی بات نہیں" اس کا
یہ کہنا تھا کہ گویا ہم پر سینکڑوں جوتے پڑ گئے ہم نے زبردستی کی
ہنسی جسکو کھسیانی ہنسی کہتے ہیں ہنسکر کہا۔" اس میں ڈرنے کی
کونسی بات ہے؟" وہ نامعقول بدتمیز کہیں کا کہنے لگا" مگر آپ تو
جیسے ڈر سے ہی جاتے ہیں، شاید یہ پہلی مرتبہ قربانی کر رہے ہیں"
ہم نے جلکر کہا۔" اور نہیں تو کیا تیری طرح خاندانی قصاب ہیں۔"
کہنے لگا" حضور میں یہ نہیں کہتا میرا مطلب تو یہ ہے کہ آپ ذرا ہمت
سے کام لے کر بس چھری پھیر دیں جسقدر آپ دیر کریں گے اسیقدر
ڈر اور بڑھے گا" اس سے پہلے کہ ہم اس بدتمیزی کا کوئی معقول
جواب دیں بیگم نے پکار کر کہا" ادھر آئیے" ہم نے کہا کہ خیر یہ اتنی دیر کی

مہلت اور مل گئی لیکن بیگم نے بلا کر جب کہا کہ "خدا کے واسطے پر قصائی
کے سامنے تو بزدلی نہ دکھائیے" بس دل یہ چاہا کہ اپنی ہی گردن پر
چھری پھیر کر اس قصہ کو ختم کر دیں لیکن جب سے ایک جانور کی جان
نہ لی جاتی ہو وہ بھلا اپنی جان کیا دیتا لہذا یہ تجویز ہی بس یوں ہی
رہ گئی اور ہم تنتناتے ہوئے قصائی کے پاس اس طرح گئے گویا
ابھی ہم اسکو بھی ذبح کر دیں گے اور بکرے کو بھی اور جاتے ہی
کہا "ہاں تو اب پھیر دوں چھری" اس نے تیار ہو کر کہا "جی ہاں
پھیرئیے، بسم اللہ اللہ اکبر" ابھی اس بکرے کو جو شرارت سوجھی تو
لگا ٹانگیں اچھالنے اب آپ ہی بتائیے کہ ایسی صورت میں
چھری پھیرنا کس طرح ممکن تھا۔ پھیرنے کو تو ہم پھیر دیتے لیکن
اگر تڑپنے میں ہمارا ہاتھ بہک جاتا اور چھری خدانخواستہ اسکے
کہیں اور لگ جاتی تو کیا ہوتا، لہذا ہم نے قصائی کو ہدایت کی کہ
پہلے بکرے کو قابو میں لائیے اسکے بعد ہم چھری پھیریں گے لیکن
اس گدھے نے کہا کہ "اجی آپ تو بس چھری پھیر دیجئے اس کو
ٹانگیں اچھالنے دیجئے" ہم نے غصہ سے اسکو ڈانٹ کر کہا "تم بھی
عجیب بیوقوف ہو اس طرح میں چھری کیسے پھیر دوں؟" یہ لوگ
بڑے منہ پھٹ ہوتے ہیں چنانچہ بدتمیزی تو دیکھئے کہ ترکی بہ ترکی

جواب دیتے ہوئے اُس گستاخ نے کہا کہ" تو پھر جانے دیجئے"
اس جواب پر ہم سے ضبط نہ ہو سکا اور ہم چھُری وہیں پھینک کر کمرہ میں
چلے آئے اور بیگم سے صاف کہدیا کہ اب تم ہی قربانی کر دیں تو اس
بدتمیز قصائی کی گستاخیاں برداشت نہیں کر سکتا" بیگم کا ہمیشہ سے
یہ دستور ہے کہ ہمارے مقابلہ میں قصائی تو کیا اگر کوئی بھنگی بھی ہو گا تو
اسی کی طرفداری کرینگی اور ہم کو جلائیں گی چنانچہ اس موقع پر بھی
انھوں نے قصائی کی بیجا طرفداری کی اور کہنے لگیں" اُس نے
کونسی ایسی بات کی جو آپ کو اسقدر غصہ آ گیا؟" مارے غصہ کے
ہمارے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور واقعی غصہ کی بات بھی تھی کہ اپنی
بیوی اپنی شریک رنج و راحت اپنی رفیقۂ حیات اور طرفداری کرے
غیروں کی اور غیر بھی کون؟ قصائی! ہم نے غصہ سے بے قابو ہو کر
کہا" کوئی بات ہی نہیں کی! کوئی بات ہی نہیں کی!! اور یہ بدتمیزی
کس نے کی تھی؟ کیا میں نے؟" ہم کو اور جلانے کے لئے زہر میں
بجھے ہوئے تبسم کے ساتھ فرمایا۔" آخر یہ کونسی بدتمیزی تھی کہ وہ آپسے
قربانی کے لئے کہہ رہا تھا اور آپ سمجھے کہ چھری ان ہی پھیر چکے
تھے" ہم نے اسی تیزی سے کہا" تو قربانی کرنے کے لئے اس
بدتمیزی سے گستاخی اور ترشے پن سے کہا جاتا ہے۔

ہم اب نہ کرینگے قربانی۔ تم ہی کرو تم ہی کو مبارک۔ بیگم نے اپنے مخصوص
مشتعل کن انداز سے کہا۔ "یہ تو خیر قربانی نہ کرنے کا بہانہ ہے" ہم نے کہا
بہانہ ہے؟" کہنے لگیں "اور کیا بہانہ تو ہے ہی" اب اس الزام کو
اپنے اوپر عائد ہوتا ہوا دیکھکر خاموش رہنا ہمارے اختیار سے باہر تھا۔
لہذا مارے جوش کے کمرے سے نکل کر قصائی کے پاس پہونچے اور
ڈانٹ کر کہا "لاؤ چھری" وہ بیگم کی شہ پاکر اور بھی بدتمیز ہو چکا تھا کہنے لگا
"لیجئے چھری" ہم نے اسکو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جانے کے انداز
سے گھور کر چھری لے لی اور منہ پھیر کر جھکے چھری پھیرنے کے لئے
قصائی نے کہا "بسم اللہ اللہ اکبر" اور ہم نے دانت کٹکٹا کر چھری پھیر دی
چھری کا پھرنا تھا کہ بکرا تو تڑپڑا کر ایک طرف بھاگا اور قصائی نے
"ہائے مار ڈالا۔ ہائے مار ڈالا" کے شور سے گھر سر پر اٹھا لیا۔ کچھ دیر
تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ واقعہ کیا ہوا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ چھری
اتفاق سے بجائے بکرے کی گردن پر پھرنے کے قصائی کے ہاتھ پر پھر گئی
اسکے ہاتھ سے خون کا فوارہ جاری تھا اور وہ تڑپ رہا تھا۔ ہم تھے کہ
چوروں کی طرح چھری لئے کھڑے تھے اور بیگم تھیں کہ جلن کے اندر
ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ ادھر تمام محلہ ہمارے دروازہ پر جمع
تھا اور خدا جانے سب ہماری طرف انگلیاں اٹھا اٹھا کر کیا کہہ رہے تھے

بہر حال ہم ملزم کے مارے پکڑے جاتے تھے اور وہ مکار قصائی کچھ تو اصلی اور کچھ ہمدردی حاصل کرنے کے لئے نقلی نیل مچا رہا تھا۔

وہ دن اور آج کا دن کہ بیگم نے کبھی ہم سے قربانی کرنیکے لیے نہیں کہا اور اگر وہ کہیں بھی اور ہم راضی بھی ہوجائیں تو اس خبر کے بعد کہ ہم قربانی کرینگے شہر کا کوئی بزقصاب ہمارے یہاں نہیں آسکتا اور گویا اب ہم کو عمر بھر کے لئے کم از کم قربانی کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے۔

مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کی تصانیف

کولتار	شریر بیوی	روح ظرافت	قبض
۶ عار	۱۲ عہ	۸ عہ	۵ ر
مرزا جنگی	روح لطافت	قرآن اور پردہ	حدیث اور پردہ
۱۲ ر	۱۲ عہ	۸ عہ	۸ عہ
	چینی کی انگوٹھی	فل بوٹ	
	۱۰ ر	۸ عہ	

سگریٹ

سگریٹ

قصہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ ہمارے عہد برخورداریت میں ہماری
ذہنیت بھی عجیب قسم کی سعادت آثار تھی اور ہمارا خیال ہے کہ اس زمانہ
میں ہر انسان کی ذہنیت معقولیت سے تقریباً اسیقدر غیر متعلق ہوتی ہوگی
جسقدر ہماری ذہنیت تھی۔ سب سے پہلی تو بات یہ کہ ہم کو اپنے بچپن سے
ایک مستقل شکایت تھی اور ہم اندر ہی اندر اس خیال سے گھلا کرتے
تھے کہ ہم کو دنیا بچہ سمجھتی ہے اور اس دنیا میں ایک بچہ سوائے اسکے
اور کسی کام کا نہیں ہوتا کہ اسکے کان پکڑ کر جس کا دل چاہے دو تین
چانٹے رسید کر دے۔ دل چاہتا تھا کہ کسی طرح اس مستقل ذلت سے نجات
حاصل کر کے ان لوگوں میں شامل ہو جائیں جن سے آج ہم پست نظر آتے
ہیں اور جن کی ماتحتی پر مجبور رہیں۔ لیکن یہ بات ہمارے اختیارات سے
اسی طرح باہر تھی جس طرح اب بچہ بنجانا ہمارے امکان میں نہیں۔ نہ تو
کسی طرح قد بڑھتا تھا اور نہ مونچھیں برآمد ہونے کا نام لیتی تھیں لیکن
ہم نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ علاوہ ان دو غیر اختیاری باتوں کے اور
باقی تمام باتوں میں ان لوگوں کی تقلید کریں گے جو ہم سے عمر میں

بڑھکر ہمپر حکومت کرتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی ہم کو مختلف قسم کے
شوق پیدا ہوئے مثلاً نہایت سنجیدگی کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو باقاعدہ
ہلاتے ہوئے چلنا، ہنسی کے لئے چوبیس گھنٹوں میں سے چند منٹ
مقرر کر دینے کے علاوہ باقی وقت میں چہرہ کو شکن آلود رکھنا، ملازموں
نہایت احتیاط کے ساتھ اپنا رعب قائم رکھتے ہوئے گفتگو کرنا، اپنے
ہم عمر لڑکوں کو اپنی اولاد کے برابر سمجھنا اور اُن کے منہ نہ لگنا اپنے
سے کچھ بڑے لڑکوں سے بھی شفقت آمیز گفتگو کرنا۔ دھوبی، مہتر،
حجام وغیرہ کے سلام کا گردن کی جنبش سے جواب دینا، انگریزی اخبار کو
آرام کرسی پر لیٹ کر روزانہ اپنے منہ کے قریب پندرہ منٹ تک
رکھنا کھانا کھانے کے بعد ایک ہیٹ کا خلال منہ میں اِدھر اُدھر
پھرانا، استنجے کے لئے ڈھیلا لیجانا، باتیں ذرا کم کرنا، وغیرہ وغیرہ لیکن
یہ تمام وہ باتیں تھیں جو ہم نے اختیار بھی کیں اور سب کے بعد دیگرے
رفتہ رفتہ ہم سے خود بخود چھوٹ کر ہم کو پھر اسی صاحبزادگی پر لے آئیں
جس سے بچنے کے لئے ہم نے ان کو اختیار کیا تھا البتہ بہت سی
چیزوں کے ہم عادی ہو کر رہ گئے جنمیں سے ایک سگریٹ بھی ہے
جو شروع تو محض اسلئے کی گئی تھی کہ اسکو منہ میں دبا کر اور منہ سے دھواں
نکالنے پر معمولی سے معمولی انسان میں ایک شان پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن بعد میں یہی شان اکثر و بیشتر مواقع پر بنی گا ہے گا ہے کر کری ہوتی رہی۔

ہمارے گھر میں سگریٹ پینے والے بزرگوں کی بفضلہ کمی نہ تھی اسکے علاوہ آنے جانے والوں کے لئے عمدہ قسم کی سگریٹیں ہر وقت والد صاحب کے ملاقاتی کمرے میں موجود رہتی تھیں لہذا ہمارا یہ شوق مفت میں پورا ہوتا رہا کہ گھر سے باہر جانے لگے اور دو تین سگریٹیں ادھر ادھر کھسکا کر جیب کے اندر اور ہم زن سے گھر کے باہر اسکے بعد تو گویا ہم کسی جمہوریہ ملک کے آزاد باشندے تھے۔ گھر سے کچھ دور کے فاصلے پر جا کر سگریٹ ہمارے منہ میں لگ گئی اور ہم نے دھواں اُڑانے کے ساتھ ساتھ اپنی چال میں ایک قسم کی اکڑ بھی پیدا کر لی اور اپنے دل میں سمجھ لیا کہ گویا اب ہم کو تمام راہگیر بڑا آدمی سمجھ رہے ہوں گے لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ ہم نہایت شان سے ٹیڑھا منہ کر کے فضاؤں میں سگریٹ کا دھواں پھیلاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور دل کو یقین ہے کہ ہم ایک بڑے آدمی سمجھے جا رہے ہوں گے کہ یکایک ہم کو کسی قریب تر گلی میں خواہ وہ کسی جانب کیوں نہ ہو نہایت بد حواسی کے ساتھ گھس جانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ ضرورت کچھ ایسی ویسی معمولی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ اسکو ٹال

دیا جائے بلکہ اگر فوراً ہی اسکی تکمیل نہ کی جاتی تو وہ تمام عزت جو سگریٹ
پی کر اتبک حاصل کی تھی معہ سود در سود کے وہین سر بازار اُڑ جاتی
لہذا ہم اس معاملہ مین ہمیشہ ہوشیار رہتے تھے کہ اس قسم کی ناگہانی
مصیبت نما ضرورت کے پیدا ہوتے ہی کسی نہ کسی طرف نو دو گیارہ
ہو جائین مگر توبہ کیجئے کہین اس قسم کی احتیاطین ہمیشہ کامیاب ہوا
کرتی ہیں؟ کبھی نہ کبھی بھانڈا پھوٹ کر رہتا ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ
ہم سگریٹ منہ مین لئے ہوئے لاٹ صاحب کی طرح بازار کا معائنہ
کرتے چلے جا رہے ہیں کہ پانچ ہی چھ قدم کے فاصلہ پر جناب
والد صاحب قبلہ و کعبہ کا ظہور ہوا۔ یہ وقت ہوتا ہو کہ انسان کا دماغ
ماؤف ہو جاتا ہے۔ دلکی حرکت اگر بند نہین ہوتی تو سول سروس کیب
کی دوڑ بنجاتی ہو۔ دسمبر کے جاڑے مین پسینہ آجاتا ہے روز روشن
مین آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہو لیکن نہ زمین پھٹتی ہے کہ
اُسمین انسان سما جائے نہ آسمان کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ
اُچک کر نگل جائے اس قسم کی حالت مین انسان جو کچھ بھی کر گذرے
تھوڑا ہے اور واقعی جو کچھ ہوتا ہو وہ فوراً غیر ارادی طور پر ہو جاتا ہو
چنانچہ ہماری ہی مثال لے لیجئے کہ اس قسم کے مواقع پر بارہا تو
ہم کو جلتی ہوئی سگریٹ منہ کے اندر مسلم چھپا لینا پڑی بعض اوقات

اسکو منھ مین چھپانے کے بعد نگلنا بھی پڑا۔ اکثر یہ ہوا کہ اس کو بجنسہ جیب کے اندر رکھ لیا وہ خود بھی جلتی رہی اور شیروانی کو بھی چپکے چپکے جلاتی رہی۔ بعض اوقات سگریٹ کو ہاتھ سے چھوڑ کر اس پر فوراً پیر رکھکر کھڑے ہو جانے کی ضرورت محسوس ہوئی مختصر یہ کہ اس قسم کے مواقع پر جو کچھ بھی ہمنے کیا وہ قطعاً غیر ارادی طور پر کیا اور اس میں عام طور پر ہم کو ہمیشہ کامیابی ہوئی مثلاً ہم نے والد محترم کو دیکھکر سگریٹ کو بغیر بجھائے ہوئے جیب مین رکھ لیا اور چلتے رہے کوشش کی کہ نظر بچا کر نکل جائین اگر کامیاب ہو سکے تو خیر ورنہ انھوں نے روک کر کہا۔

"میاں کہاں پھر رہے ہو؟"

"جی یونہی۔ ذرا ایک لڑکے سے کتاب لینے جا رہا ہوں"

جیب میں سگریٹ جل رہی ہے اور استر بھی۔

"تو کیا تمھارے پاس وہ کتاب نہیں ہے؟

"ہے تو۔ نہیں ہے۔ یعنی ذرا خراب ہے۔ اُسکے کچھ ورق نہیں ہیں۔ پُرانی ہے۔" منہ ہٹائے ہوئے کہ کہین بد بو نہ سونگھ لیں۔

"بھائی تو نئی لے آتے یہ بھیک مانگنا تو اچھا نہیں۔"

" جی ہاں لے آؤں گا، کل پرسوں مگر۔ یعنی کہ اونھ آج ہی دیکھنا ہے"۔۔۔۔۔۔۔ اسٹر جلاکر سگریٹ گر پڑی اور ہم نظر بچا کر اسپر سوار ہو گئے۔

" اچھا تو جلد واپس آنا۔"

ہم جان بچی لاکھوں پائے کہکر وہاں سے کھسکے لیکن شاید آپکو یہ نہ معلوم ہوگا کہ اس دوران میں کتنا خون خشک ہو گیا اور کتنا خون پانی بنکر بشکل پسینہ بہگیا۔ بہرحال کوشش کامیاب ہوئی اور کوشش ہی کیا کہئے کہ خدا نے عزت رکھ لی۔ بشیرہ اپنی کی جیب اور اُس سے متصل تھوڑا پائجامہ ضرور جل گیا لیکن ہمکو ستی ہونا نہین پڑا۔ یہ تو مثال اس قسم کے حادثات کی ہے جنمیں ہم محفوظ رہے۔ " رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کا معاملہ ہوکر رہگیا۔ لیکن بعض اوقات ہم اس بری طرح پھنسے ہیں کہ خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اسکول میں ماسٹر صاحب سے پیشاب کی اجازت لیکر پاخانے جا رہے تھے تاکہ سگریٹ پی لیں اسلیے کہ واضح رہے کہ اسکول میں پاخانے سے زیادہ سگریٹ نوشی کی کوئی پُرامن جگہ نہیں ہے پاخانے کے قریب پہونچکر جیسے ہی ہم نے دیاسلائی اور سگریٹ کی ڈبیہ نکالی ہے کسی نے پیچھے سے آنکھیں

بند کریں ہم فوراً سمجھ گئے کہ یہ شریر سلیمان کی حرکت ہو ہم نے کہا۔
"ابے چھوڑ مردود کہیں کے"
مگر وہ چپ کھڑا رہا ہم نے پھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"ابے چھوڑتا ہے کہ نہیں، او گدھے کہیں کے، ابے یار چھوڑ دو ہیڈ ماسٹر صاحب آتے ہوں گے، اچھا بیٹا نہ چھوڑو، اچھا اب ہو چکا مذاق چھوڑ دو، ابے سلیمان، او سلیمان کے بچے چھوڑ۔ اگر سگریٹ پینا ہے تو چھوڑ دو۔
اُسنے ایک ہاتھ سے سگریٹ لے لی اور ہم نے کہا۔
"ہاں سگریٹ لیلو مگر چھوڑ دو۔"
اب ہم آزاد تھے مگر گھوم کر وہ منظر دیکھا ہو کہ اگر کوئی کمزور دل کا انسان ہوتا تو اسکی روح وہیں قفس عنصری سے عالم بالا کی طرف پرواز کر جاتی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سگریٹ اور دیا سلائی لئے ہوئے کھڑے ہیں اور ہم کو گھور رہے ہیں۔
اس کے بعد کیا ہوا اس کا ہم کو مطلق علم نہیں اسلئے کہ ہم اپنے حواس میں نہ تھے البتہ اتنا یاد ہو کہ ایک درجن کے اندر ہی اندر بید پڑے تھے۔

مگر خدا کرکے وہ دور گیا گھر میں بھی ہم آزادانہ دُھواں دھار سگریٹ نوشی کرنے لگے اور باہر بھی۔ اسکول سے بھی نجات مل گئی۔ اور والد صاحب کا ڈر بھی اُٹھ گیا۔ لیکن اب ہماری شریک حیات کچھ سکھ قسم کی خاتون معلوم ہوتی ہیں جو سگریٹ کے دھوئیں کو حرام اور اسکی بد بو کو مکروہ سمجھتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ہمارا بالکل یہ حال ہے کہ

جب تو گھبرا کے یہ کہتے تھے کہ مر جائینگے
اب مر کے ہیں تو یہ کہتے ہیں کدھر جائینگے
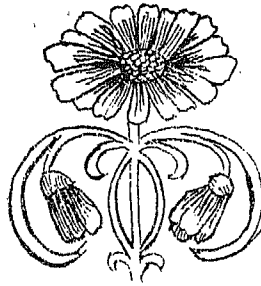
قطعِ کلام

قطع کلام

یہ تو ہم کہتے نہیں کہ میر صاحب جان بوجھکر ہم کو چھیڑتے تھے
لیکن ان کی عادت کہ اپنے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو بات ہی
نہ کرنے دیں گے بعض اوقات اسقدر تکلیف دہ ثابت ہوتی تھی کہ
دل چاہتا تھا کہ یا تو خود اپنا سر دیواروں سے ٹکرا کر پھوڑ دیں۔ یا
میر صاحب قبلہ کا منہ نوچ لیں۔ لیکن ہوتی ان دونوں باتوں میں سے
ایک بھی نہ تھی اور ہمیشہ دانت پیس کر رہ جانے پر معاملہ ٹلتا رہتا تھا
لیکن میر صاحب تھے کہ ہماری اس خاموشی سے فائدہ اُٹھا کر
روز بروز شیر ہوتے جاتے تھے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم انکو متوجہ ہی کیوں کرتے تھے
جو اس عذاب میں مبتلا ہوں۔ لیکن آپ کو یہ نہیں معلوم کہ وہ ایک
باوضع انسان تھے جس سے ایک مرتبہ صاحب سلامت ہو گئی
بس مرتے دم تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے خواہ وہ کیسی ہی
بے رُخی برتے لہٰذا ان کے لئے اسکی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ
کوئی ان کو متوجہ کرے بلکہ وہ تو خود متوجہ کر لیا کرتے تھے اور بس
یہی ان کے لئے کافی ہوتا تھا۔

اب آپ ہی بتائیے کہ یہ ہم سے کس طرح ہو سکتا تھا کہ ہم تو

ان کو راستہ میں دیکھکر منہ چڑایا لیکن اُنھوں نے ہم کو دیکھتے ہی گرفتار کر لینے کے انداز سے ڈپٹ کر "السلام علیکم" کہا، ظاہر ہے کہ اب ہم جواب دینے کے پابند ہو گئے۔ اور وعلیکم السلام کہکر مجرموں کی طرح ان کے سامنے خاموش کھڑے ہو گئے۔ اسلئے کہ جانتے تھے کہ ذرا بھی بولے تو پھر بولنے کی سزا بھگتنا پڑے گی لیکن انھوں نے خود دریافت کیا "کہئے اب بلند اقبال کا کیا حال ہے" ہم نے بات ٹالنے کے لئے نہایت اختصار کے ساتھ عرض کیا" وہی حال ہے" حیرت سے آنکھیں نکال کر کہنے لگے۔" وہی حال ہے یعنی ابتک اسہال کا سلسلہ جاری ہے؟" عرض کیا" جی ہاں جاری تو ہے مگر یہ تو بچوں میں ہوتا ہی رہتا ہے کہ کبھی بخار ہے تو کبھی کھانسی، کبھی آنکھ دکھ رہی ہے تو کبھی جگر بڑھا ہوا ہے کبھی"۔ بات کاٹ کر کہنے لگے "آپکا قطع کلام ہوتا ہے، یہ تو سب کچھ ہے مگر جناب اسکو معمولی بات نہ سمجھئے بلکہ باقاعدہ علاج کیجئے ورنہ معدہ اسی کا عادی ہو جائیگا۔ اور پھر کچھ بنائے نہ بن پڑے گی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یا تو ماں کا دودھ خراب ہے ورنہ وہ بد پرہیز ہیں اور بالکل وہی معاملہ ہے جو کپتان عبدالغفور خاں کے بچہ کی علالت کے سلسلہ میں پیش آیا کہ بچہ بیمار ہے اور یہی اسہال جاری ہیں تمام دنیا کے اطباء انگریزی و یونانی کا علاج ہو چکا ہے اور اب تمام خاندان اس بچہ کی

طرف سے مایوس ہو گیا۔ ایک موٹا تازہ گلاب کے پھول کی طرح
شاداب بچہ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ بس ہڈی اور چمڑا رہ گیا ہے
آخر میں میں نے حکیم محمود خاں اعظم کو دہلی خط لکھا میرے ان کے
بڑے تعلقات تھے اور وہ مجھے بہت مانتے تھے بلکہ جب کبھی
میں دہلی جاتا تھا تو ان ہی کے یہاں ٹھہرتا تھا۔ دن دن بھر
بس شطرنج جمی رہتی تھی ان کو اپنے شاطر ہونے پر بڑا ناز تھا۔
لیکن اگر انھوں نے کسی کا لوہا مانا ہے تو وہ یہ خاکسار ہے۔ مگر
ایمان کی کہوں گا کہ اسکے اٹھ جانے کے بعد سے مجھکو بھی یہ معلوم
ہوتا ہے کہ میرے ساتھ ٹکر کی شطرنج کھیلنے والا اب کوئی نہیں ہے
اور پھر شطرنج کھیلنے میں مرحوم کے لطیفے ہائے ہائے کیا انسان تھا
اور کاہیکو ایسے انسان اب پیدا ہوں گے تو ہاں جناب میں نے
ان کو خط لکھا کہ کپتان عبدالغفور کے بچے کا یہ یہ حال ہے اور اب
آپ ہی سے اُمید ہے کہ خدا آپکے ہاتھ سے شفا دے گا خط ڈالکر
میں مطمئن ہو گیا اور کپتان صاحب کو بھی اطمینان دلایا۔ لیکن وہ تو
اس بچہ کی طرف سے بالکل مایوس ہی تھے ان کو اطمینان نہیں ہوا
بہرحال پانچویں دن میرے خط کا جواب آیا۔ میں نے بڑے شوق
سے لفافہ کھولا تو دیکھتا کیا ہوں کہ اس میں صرف یہ لکھا ہوا ہے کہ

ماں کا دودھ چھڑا کر بکری کا دودھ دیا جائے۔ باقی جو علاج بھی ہوگا مفید ہوگا۔ مجھکو یہ خط دیکھکر بڑا غصہ آیا اور میں کپتان صاحب بڑا نادم تھا کہ وہ کیا کہیں گے لیکن جب کپتان صاحب نے خود حکیم صاحب کے خط کا تقاضا کیا تو میں نے خط نکالکر چپکے سے دکھا دیا معلوم نہیں کیا بات تھی کہ جو بات میری سمجھ میں آتی تھی وہ کپتان صاحب کے ذہن میں جم گئی اور انھوں نے فوراً ایک جمناپاری بکری خرید کر اسکا دودھ بچہ کو شروع کرا دیا اور ماں کا دودھ بند کر کے باقی تمام علاج ہی بند کر دیا۔ لیکن جناب خدا کو یہ منظور تھا کہ حکیم محمود خاں کے سر سہرا رہے اور میں سرخرو ہوں لہذا بچہ کو چٹکی بجاتے فائدہ ہونا شروع ہوا اور اب ماشاء اللہ خود بچوں والا ہے اور دہلی میں نہایت دھڑلے کی بیرسٹری کر رہا ہے تو جناب آپ ماں کا دودھ بند کرائیے۔"

ان کی اس بکواس سے تنگ آ کر میں نے کہا۔

" اور بکری بھی خرید لوں۔"

بس پھر گویا میں نے آتشبازی کے قلعہ میں دیاسلائی لگا دی۔ کہنے لگے۔" اجی بکری خریدو یا گائے کا دودھ دو مگر ماں کا تو ہرگز ہرگز دودھ نہ دو۔"

ہم نے اس خیال سے کہ اب یہ ہم کو چھوڑ دیں "بہت بہتر" کہکر
اجازت حاصل کرنے کے لئے ارادہ ہی کیا تھا کہ وہ پھر بولے
" مگر اس سے پہلے کہ اسکو بکری وغیرہ کا دودھ دو مجھ کو اس کا
پورا حال بتاؤ کہ شاید میں کوئی اور مشورہ دے سکوں" عرض کیا کہ
"اسکو چھ ماہ سے یہ شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ بالکل اچھا خاصہ
وکوئی بیماری ہو نہ کچھ۔" بات کاٹ کر کہنے لگے کہ" یہ تو بڑی اچھی
بات ہے۔ خدا کرے وہ ایسا ہی رہے۔ پھر آپ چاہتے کیا ہیں"
عرض کیا "سنئے تو سہی میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ وہ بالکل اچھا
رہتا ہے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی" بس یہیں سے میری زبان
بند کر کے کہنے لگے " بھائی وہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ خدا کا شکر
ادا کرو اور تم کو کیا چاہئے"۔ ہمارا دل چاہا کہ میر صاحب کی اور اپنی
جان ایک کردیں لیکن ان کی بزرگی کا خیال آگیا اور ہم نے
ضبط کر کے کہا۔" پوری بات بھی سنئے گا یا نہیں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں
کہ ایک ماہ سے اسکو دست آنے لگتے ہیں" پھر ہماری زبان بند کردی
اور تڑسے بول دیے" اچھا اچھا اب یہ بات بالکل صاف
ہو گئی ہاں یہ ہوتا ہے اکثر بچوں میں اور یہ کوئی گھبرانے کی
بات نہیں خود میرے منجھلے پوتے کا بالکل یہی حال تھا ہاں تو
آپ پورا حال فرمائیے پھر میں عرض کروں"۔ ہم نے عرض کیا

"دست آنے کے ساتھ ہی کمزوری اسقدر بڑھ جاتی ہے کہ بس لت پت ہوجاتا ہے اور" اُنکی زبان پھر نہ مانی اور خود بخود چلدی۔ "یہ بھی کوئی گھبرانے کی بات ہے۔ اسلیئے کہ دست آنے کے بعد کمزوری کا پیدا ہونا ضروری ہے ہاں تو پھر۔" ہم نے جلدی جلدی گھاس کاٹنے کے انداز سے کہنا شروع کیا اور طے کرلیا کہ اب سانس نہ لینگے ورنہ جہاں سلسلہ ٹوٹا وہیں یہ کمبخت بولنا شروع کریگا۔ "چنانچہ ہم حال کہہ رہے تھے اور وہ ہماری تیز گفتاری سے اسطرح مجبور تھے جس طرح تھوڑی دُور تک موٹر سائیکل کا تعاقب کرنے کے بعد کتا مجبور ہوجاتا ہے لیکن ان کا بولنے کو کچھ اسطرح دل چاہ رہا تھا کہ وہ بےچین سے ہونے لگے ایک دو مرتبہ تو ہاتھ کے اشارے سے روکنے کا ارادہ کیا لیکن پھر مجبور ہوگئے ہاتھ اُٹھا کر ہکوڑ کا۔ اور منھ کھولکر کہدیا" آپکا قطع کلام ہوتا ہے لیکن یہ حال اور بالکل یہی حال میری بھانجی کے لڑکے کا ہے جسے میں نے کرنل اسٹیونس تک کو دکھایا مگر فائدہ ہوا تو حکیم احسان اللہ خاں کے علاج سے اور وہ بھی چٹکی بجاتے ہوئے یعنی اُس اللہ کے بندے نے خدا اُسکی عمر میں برکت دے چار پیسہ کا ایک مجرب نسخہ لکھدیا کہ چار ہزار روپیہ میں بھی سستا ہے۔" ہم نے عرض کیا سستے اور

ہنگے کا خیال نہیں بات تو یہ ہے کہ۔ کہنے لگے" ذرا معاف کیجیے، گا آپکا قطع کلام ہوتا ہے میرا یہ مطلب نہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ دیکھئے اس کم حقیقت گھاس پھوس میں خدا نے کیا قدرت رکھی ہے اور یہی خس و خاشاک بعض اوقات آب حیات ثابت ہوکر رہتی ہو" عرض کیا" یہ بالکل صحیح ہو" کہنے لگے " آپکا قطع کلام ہوتا ہے۔ صحیح نہیں ہو بلکہ یہ دیکھئے تو کہ خداوند کریم نے اس میں اپنی قدرت کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے"۔ ہم بھی عجیب بیجیا تھے پھر بولے" ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر وہ جو کچھ چاہے کرسکتا ہے زہر کو بھی" کہنے لگے" آپکا قطع کلام" سچ تو ہو کہ اب تو ضبط کرنا ہمارے اختیارات سے باہر ہوتا جاتا تھا اور واقعی ہم کہاں تک ضبط کرسکتے تھے جب میر صاحب نے یہ طے کرلیا تھا کہ خود ٹرٹراتے جائیں گے ہم کو بولنے بھی نہ دیں گے بلکہ اگر ہم بولنے کی کوشش بھی کرتے تھے تو وہ ظالم ہمکو بولنے نہ دیتا تھا اور بلا تکلف ہمارے بھیجے کو کھائے جاتا تھا مگر ہم کرتے تو کیا کرتے وہ اول تو بزرگ تھے دوسرے وہ اپنے خیال سے ہمارے ساتھ یہ دشمنی بھی محبت سمجھکر فرما رہے تھے اور ان کو واقعی اس کا احساس بھی نہ تھا کہ ان کو بکواس کا مرض ہو بلکہ انھوں نے کبھی اسپر بھی غور نہ کیا کہ لوگ ان کو" میر بک بک" کیوں کہتے ہیں۔

سید صاحب مسلسل کچھ فرما رہے تھے لیکن ہمارے کان انکی آواز سے اس طرح عادی ہو چکے تھے جس طرح کسی پرسکون مکان کے باہر جھینگر کی آواز غیر محسوس ہو جاتی ہے اور سماعت پر اس کا بار نہیں ہوتا۔ لیکن اسکے باوجود بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر دھوپ میں کھوپڑی چٹخانے میں بھی کوئی معقولیت ہمارے ذہن میں نہ آتی تھی لہذا ہمکو میر صاحب کی بکواس سے زیادہ اس حماقت پر غصہ آرہا تھا مجبوراً ہم نے یہ طے کیا کہ میر صاحب پر ایسی دفعہ ۱۴۴ لگائیں کہ وہ بھی برا نہ مانیں اور ہمارا مطلب بھی پورا ہو جائے یہ طے کرنے کے بعد ہم نے بھی وہ ترکیب نکالی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ آجتک میر صاحب کس سے سابقہ پڑا تھا چنانچہ ہم نے بھی قطعہ کلام کا ایک توڑ ایجاد کیا اور اس ایجاد کے بعد جیسے ہی میر صاحب نے کہا۔

"بھلا میں جھوٹ کہتا ہوں"

اگر ہم نے یہ توڑ ایجاد نہ کیا ہوتا تو سر ہلاتے جاتے اور میر صاحب اپنی ہانکے جاتے مگر ہم نے ابکی یہ کیا کہ جیسے ہی انھوں نے کہا۔ "بھلا میں جھوٹ کہتا ہوں؟" ہم نے فوراً کہا" اور کیا" بس جناب معلوم یہ ہوا کہ تیز رفتار بائیسکل میں اگلا اور پچھلا دونوں بریک لگا دیے ہیں وہ ایک دم سے چپ ہو گئے اور ہکا بکا ہو کر ہمارا منہ

دیکھنے لگے پھر کہا " بھائی یہ دیکھو کہ کتے بھونکا کرتے ہیں اور قافلہ گذر جاتا ہے۔ ہم نے کہا " یہ کوئی ضروری نہیں ہے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ قافلے والے ڈر کر ٹھہر جائیں اور کتوں کو جب تک ڈھیلے مار کر بھگا نہ لیں اسوقت تک نہ گذر سکیں۔" لاپروائی سے کہنے لگے " خیر یہ تو کوئی بات نہیں" ہم نے پھر اپنے اختلاف سے ان کے قطع کلام کا قطع کلام کر دیا اور کہا " بات کیسے نہیں ہے۔" جلدی سے بات ٹالنے کو کہنے لگے " اچھا ہے بات ہے خیر ہوگی تو ہاں" ہم نے اصرار سے کہا " یہ نہ ہوگا پہلے ہم کو اس بات کی طرف سے مطمئن کیجئے پھر آگے بڑھئے" کچھ الجھکر کہنے لگے ---

" لاحول ولا قوۃ ارے بھائی فرض کر دو کہ چاند نکلا ہے" ہم نے پھر انسے ان کے قطع کلام کرنے کا انتقام لیا۔" چاند نکلا ہو یہ بھی ایک ہی رہی ارے بھائی سورج نکلا ہے سورج " ڈانٹ کر کہنے لگے " ارے میاں فرض کر لو" ہم نے بھی کڑک کر کہا " اندھی بات کیسے فرض کریں۔ کہیں دن کو بھی چاند نکلا ہے" کہنے لگے " تو پھر جانے دو عجیب قسم کے بیوقوف ہو" ہم نے بات ختم کرنیکے انداز سے کہا۔" خیر بیوقوف سہی لیکن دن کے وقت چاند کو نکلا ہوا فرض کر کے زیادہ بیوقوف بننا نہیں چاہتے۔" میر صاحب

کچھ برداشتہ خاطر ہو کر چلے گئے اور ہم اپنی کامیابی اور قطع کلام سے توڑ والی کامیاب ایجاد پر خوش تھے اور واقعی اگر ہم خاموشی سے چاند کا نکلا ہونا فرض کر لیتے تو وہ پھر یہ کہکر "اس کو دیکھ کر کتے بھونکتے ہیں مگر اس کا کچھ نہیں بگڑتا" اپنی گفتگو کا لامتناہی سلسلہ پھر شروع کر دیتے لیکن اس زبردستی کے اختلاف والی ایجاد نے ان کے قطع کلام کو بھی چاروں شانے چت کر کے چھوڑا اور ہماری جان بچی۔
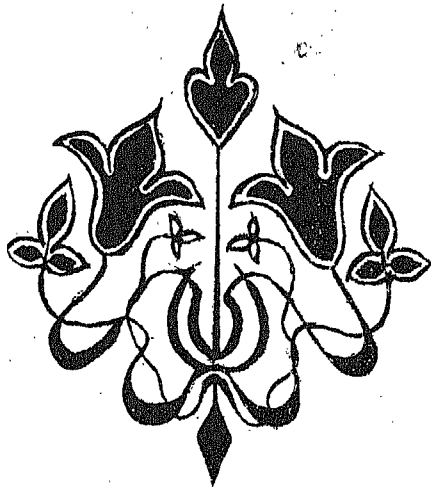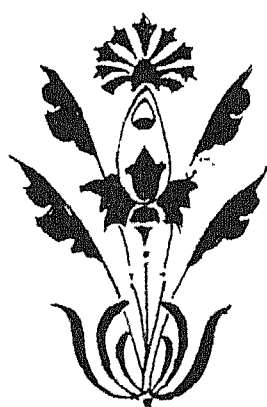
شامت

شامت

جب کام کرنے کے بعد چھٹی پاکر نہایت اطمینان کے ساتھ ٹانگیں پھیلا کر آرام کرسی پر لیٹنے کا موقع ملتا ہو اور سلگنے والے حقہ کی لپٹ پر خوشبو شامہ نوازی کرتی ہو اسوقت بس گانیکو دل چاہتا ہے۔ بلکہ غیر ارادی طور پر ہم تو گانا شروع بھی کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو یہی خوشگوار لمحات میسر تھے اور ہم حقہ کی نے منہ میں لئے ہوئے زیر لب "جیا را کسکے مسکے ہو" پر اپنی موسیقی کے تمام کمالات صرف کر رہے تھے کہ خدا جانے کس طرف سے ایک بڑے میاں بالکل ہمارے سر پر آ پہونچے اور ہم "کسکے مسکے کسکے مس" کرکے ان کو دیکھتے ہی کچھ چونک پڑے۔ اُنھوں نے پوچھا "شوکت تھانوی؟" ہم نے کہا "فرمائیے" اُنھوں نے کہا "کہاں ہیں؟" ہم نے کہا "کام بتائیے" لیکن اُنھوں نے کام بتانے سے انکار کرتے ہوئے بس ہم ہی کو ہم سے پھر پوچھا اور ہم کو مجبوراً کہدینا پڑا "اسی خاکسار کو کہتے ہیں۔" لیکن اُنھوں نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ ہم کو جھوٹا سمجھ رہے ہیں اور فوراً مزید اطمینان کرنے کے لئے ہم سے اقبال کرایا

"آپ ہی شوکت تھانوی ہیں؟" ہم نے سچ بولنے کے انداز سے عرض کیا "جی ہاں میں ہی شوکت تھانوی ہوں" معلوم نہیں بڑے میاں کو یقین آیا یا نہیں بہرحال وہ اسطرح اطمینانی سانس لیکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ گویا وہ عمر بھر ہماری ہی تلاش میں رہے ہیں، اور اب ہم کو ڈھونڈھ کر ہمارے ہی ہو رہیں گے۔ ہمنے لاکھ لاکھ بڑے میاں کے حدود اربعہ پر نظر کی لیکن سوائے اسکے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ بٹیر بازی کے ماہرین میں سے معلوم ہوتے ہیں اور کامدانی بنانے میں لکھنؤ کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔ بڑے میاں نے ہمکو پھر گھورا اور اپنا پوپلا منھ چلاتے ہوئے پھر کہا "آپ ہی شوکت تھانوی ہیں نا؟" یہ سوال وہ پہلے دو تین مرتبہ کر چکے تھے۔ لیکن اب ہم کو اس سوال سے ڈر معلوم ہونے لگا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ اگر یہ ملک الموت ہیں تو اس تحقیق کی کیا ضرورت اُن کو خود معلوم ہوگا کہ ہم کون ہیں۔ لیکن پھر ہم نے سوچا کہ وہ پوری طرح تحقیق کرنے کے بعد روح قبض کریں گے کہ کہیں ایسا نہ ہو شوکت تھانوی کے دھوکے میں کسی اور بیگناہ کی جان لے لیں۔ لہٰذا ہم نے ذرا مضبوط ہو کر جواب دیا "عرض تو کیا کہ میں ہی شوکت ہوں" یہ سُن کر بڑے میاں نے اپنی شیروانی نہیں بلکہ اچکن کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہم سمجھ گئے کہ یہ انقلاب پسند جماعت کا کوئی شخص ہے

اور اب اسکے ریوالور کی ایک گولی ہمارے تمام سودیشی مضامین کا انتقام لے لیگی۔ لیکن کرتے تو کیا کرتے، موت برحق تھی اور بھاگنے کا موقع نہ تھا۔ مجبوراً مرد بنے بیٹھے رہے۔ مگر بڑے میاں نے بجائے ریوالور کے جیب سے ایک کاغذ نکالکر رازدارانہ طریقہ پر رشوت کی طرح چپکے سے ہمارے ہاتھ پر رکھدیا۔ اس کاغذ پر ہمارا نام معہ پتہ بالکل اسطرح لکھا ہوا تھا۔

جناب شوکت تھانوی

لاٹوش روڈ۔ سرپنچ چھاپہ خانہ

"تسلیم۔ یہ ہادی حسین آتے ہیں۔ ان کو کاغذ میں سب حال تحریر کرکے دیدیجئے۔ ان کو کچھ معلوم نہیں ہے نہ کہئے گا۔ فقط فقط کے بعد کسی کا کوئی نام وام نہیں تھا۔ لہذا خط کی عبارت ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ اردو ہماری مادری کیا بلکہ فادری زبان بھی ہے، دن رات اردو بولتے، لکھتے بلکہ اوڑھتے اور بچھاتے رہتے ہیں۔ لیکن اس معمولی سی عبارت کو سمجھنا ہمارے لئے مشکل ہوگیا اور واللہ اگر کبھی امتحان میں یہی عبارت پرچہ میں آجاتی کہ سلیس اردو میں ترجمہ کرو تو ہم کو صفر سے زیادہ کچھ نہ ملتا۔" ہادی حسین آتے ہیں" خیر وہ تو آئے اور اب تک سامنے بیٹھے ہوئے اونگھ رہے ہیں لیکن "ان کو کاغذ پر سب حال تحریر کرکے دیدیجئے۔" کس کا حال؟ کیا حال

بس یہیں سے دماغ چکرانا شروع کرتا تھا اور پھر طرّہ یہ کہ "ان کو کچھ معلوم نہیں ہے نہ کہئے گا" لاکھ لاکھ دماغ پر زور دیا ہر طرح سمجھنے کی کوشش کی مگر کچھ ذہن میں نہ آیا کہ یہ کس کا خط ہے اور وہ کونسی بات ہے جو پوچھی گئی ہے۔ مجبوراً جب دماغ سوچتے سوچتے سُن ہو گیا تو بڑے میاں کو اونگھتے سے ہوشیار کرنا پڑا۔

"یہ آپ کہاں سے لائے ہیں؟"

بڑے میاں۔ "وکٹوریہ گنج سے"

ہم۔ "وکٹوریہ گنج سے؟ اور کس نے بھیجا ہے؟"

بڑے میاں۔ "منجھلی بیگم نے۔"

ہم۔ "منجھلی بیگم نے؟ کون منجھلی بیگم؟"

بڑے میاں۔ "منجھلے نواب کے گھر میں۔"

ہم۔ منجھلے نواب کے گھر میں؟ میں نہیں سمجھا؟

بڑے میاں۔ اے جناب آپ کیسے نہیں سمجھے؟ مجھے خود منجھلی بیگم نے یہ خط دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ آپ ہی کے ہاتھ میں دوں اور اس کا جواب لیجا کر اُن ہی کو دیدوں کسی سے کچھ نہ کہوں، مگر آپ سمجھتے ہی نہیں۔"

تعلقات تو یقیناً گھر سے معلوم ہوتے تھے اور ہمارا پہچاننا

واقعی قابل شرم تھا۔ لیکن ہم واقعی بالکل نہ پہچان سکے کہ یہ منجھلی بیگم کون بلا ہیں؟

لہٰذا ہم نے پھر کہا۔ "میرے ذہن سے اُن کا خیال اُتر گیا ہے ذرا تم مفصل پتہ بتاؤ تو سمجھوں۔"

بڑے میاں "اے میاں، منجھلی بیگم جو کانپور کے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ ابھی سال بھر ہوا اُن کی شادی منجھلے نواب سے ہوئی ہے منجھلی بیگم کی والدہ تین سو روپیہ پاتی تھیں۔ ان کا تھوڑے دن ہوئے انتقال ہوگیا ہے اور اب وثیقہ بھی اُن ہی کو ملتا ہے وہ آپکو خوب جانتی ہیں، آپکا نام لیا پتہ بتایا۔ مگر آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے جانتے ہی نہیں۔

اسوقت منجھلی بیگم کو نہ پہچاننا ہم کو خود بُرا معلوم ہورہا تھا۔ بھلا غور تو کیجئے، پڑھی لکھی جوان یعنی بارسال شادی ہوئی ہے۔ تین سو روپیہ ماہوار نقد پانے والی اور خوبصورت بھی ضرور ہوں گی۔ ان کو ہم نہیں پہچانتے تھے۔ اب یہ ہماری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے وہ اللہ کنواں پیاسے کے پاس آیا تھا لیکن جب پیاسا اندھا ہوجائے، اسکی عقل پر پتھر پڑجائیں اُسکے دماغ میں بُھس بھر جائے تو اسکا کیا علاج۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم منجھلی بیگم کو چراغ لیکے

ڈھونڈھتے تو وہ نہ ملتیں اور اب چھپّر پھاڑ کر خدا نے ـــــــ
اُنھیں ہم کو دیا تھا تو ہم ایسے کمبخت کہ اس نعمت سے بھی فائدہ نہیں
اُٹھا رہے تھے۔ واللہ منجھلی بیگم تو سونےکی چڑیا تھی جو خود بخود ہمارے
ہاتھ پر آکر بیٹھ گئی۔ جسنے خود اپنے کو صید بنا کر پیش کیا۔ مگر واہ رے عقل کے
دشمن ہم کہ اس خزانہ پر لات مار رہے تھے۔ لیکن ہم کرتے تو کیا کرتے
ہماری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ منجھلی بیگم کون ہیں؟ مجبوراً ہم نے
ایک کاغذ اُٹھایا اور لکھدیا:-

"محترم یا محترمہ۔ تسلیم۔ میں آپکو بالکل نہ پہچانا آپ
اپنا مفصل تعارف کرائیے تاکہ یہ معمہ حل ہو جائے
پھر کچھ حال لکھوں گا۔ شوکت تھانوی"

خط لکھا اور بڑے میاں کو دیدیا۔ وہ خط پاتے ہی
"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" ہو گئے۔ اور ہم منجھلی بیگم کے
تصور میں ایسا غرق ہوئے کہ شاید اُن سے ملکر بھی ایسا نہ ہوتے۔ طرح
طرح کے خیالات ذہن میں آتے تھے اور مٹ جاتے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ
دراز ہی ہوتا گیا اور ہم اُسوقت چونکے جب نسیم نے ہمکو چونکایا لیکن
اس چونکنے کے بعد ہی یہ حالت ہوئی کہ پیٹ میں چوہوں نے
پلٹنگ کرنا شروع کر دی کہ ہم کس طرح یہ رومانی واقعہ نسیم کو

سنادیں لیکن اب ہم کو پس وپیش یہ تھا کہ یہ راز ہے، اور راز بھی کیسا راز جس کا تعلق راز دنیا سے ہے۔ اسکو تو بس منجھلی بیگم سمجھیں یا ہم جانیں کسی تیسرے کو تو کوئی حق ہی نہ پہونچتا تھا کہ وہ اس کو معلوم کرے مگر تو یہ کیجئے کنسکا فرسے ضبط ہو سکتا تھا۔ لاکھ لاکھ سوچا کہ یہ بُری بات ہی مگر آخر کار نتیجہ یہی ہوا کہ نسیم سے کہدیا " ارے یار کچھ اور بھی سُنا؟" نسیم نے حیرت سے پوچھا "کیا؟" ہم نے چپکے سے منجھلی بیگم کا نامۂ شوق اُن کے سامنے رکھدیا۔ انھوں نے اسکو پڑھا اور پڑھکر وہ سوال کیا جو بغیر پڑھے کرنا چاہیئے تھا۔ کہنے لگے "یہ کیا ہے؟" ہم نے کہا "تم ہی بتاؤ" کہنے لگے "میں کیا جانوں" ہم نے کہا "اور واللہ ہم بھی کچھ نہیں جانتے" ہنسکر کہنے لگے "کیوں بنتے ہو؟" ہم نے قسم کھا کر کہا " واللہ ہم خود حیران ہیں کہ یہ ماجرا کیا ہے نہ ہم سے کسی منجھلی بیگم کی شناسائی نہ کچھ اور یہ خط آپہونچا" لا پروائی سے کہنے لگے " دماغ پر زور دو اور یاد کرو" ہم نے جلکر کہا۔ "بھائی یہ کام بغیر تمھارے کہے تین گھنٹہ سے کر رہا ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا" اب انھوں نے بھی معاملہ کی نزاکت کو سمجھ لیا اور مدبروں کی طرح بیٹھ کر غور کرنے لگے۔ اِدھر اُدھر آنکھیں چلائیں، پیشانی پر شکنیں ڈالے اور مٹاتے رہے لب زیریں کو ٹیڑھا کرتے دانتوں سے

دبا لیا۔ کلمہ کی اُنگلی کو کنپٹی پر رکھا۔ ایک آدھ مرتبہ خود ہی "ہوں ہوں"
کہا۔ سر کھجایا کئے اور اسی طرح تھوڑا سا وقت گذار نیکے بعد ایک لمبی سی
سانس کھینچکر تالی بجائی اور کہنے لگے "ہم سمجھ گئے" ہم نے حیران
ہوکر پوچھا "کیا؟" کہنے لگے "بس سمجھ گئے" ہم نے زور دیکر
کہا۔ "آخر کیا۔ کچھ کہو تو" کہنے لگے۔ "قصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ
منجھلی بیگم کوئی خوش مذاق عورت ہے اسنے تمہارے مضامین پڑھے ہیں
تمہارا کلام دیکھا ہے اور اب کہیں بیچاری نے تمہاری تصویر دیکھی ہے
یہ خط سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ تم کو اس مہمل طریقہ پر متوجہ
کرنا چاہتی ہے اور پھانسنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اگر تم
اسطرح نہ بھڑکے تو اُسنے پالا مار لیا۔ پھر تو وہ سب کچھ ضرور اُگل دیگی
لیکن اگر تم اس چمکارنے سے بھڑکے تو وہ گول ہو جائے گی۔
اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟ ہم نے جو کچھ کیا تھا من وعن
بتا دیا اسلئے کہ نسیم کی گفتگو سے ہم کو اندازہ ہوا تھا اور پہلی مرتبہ
اندازہ ہوا تھا کہ یہ شخص جسقدر شئے لطیف سے بیگانہ نظر آتا ہے دراصل
اسقدر بیگانہ نہیں ہے بلکہ بڑا گھاگ آدمی ہے چنانچہ اُسنے جو رائے
قائم کی تھی وہ ہمارے ذہن میں اُتر گئی۔ ہمارے جواب کا مضمون
سُن کر نسیم نے کہا "بس بہت ٹھیک ہے۔ اب دیکھئے گا کہ

وہ مستاۃ کاغذ پر کلیجہ نکال کر بھیجیں گی" اسکے بعد ہمارے اور بسم کے درمیان رسائل میں تصاویر چھپوانے پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اسکے فوائد پر بحث ہوئی اور آخر کار یہ طے پایا کہ رسائل میں تصاویر کا شائع ہونا کبھی کبھی بہت مفید ہوتا ہے۔ ہم نے کہا۔" مگر یار یہ تو بتاؤ کہ وہ میری کونسی غارتگر تصویر ہو سکتی ہے جسنے منجھلی بیگم کو بے قابو کر دیا" کہنے لگے "خدا جانے کس تصویر نے جادو کر دیا؟ غالباً صبح تبسم والی تصویر ہو گی۔ مگر نہیں وہ کیسے ہو سکتی ہے؟ آپکی تو میری تصویر بھی تھی میرے خیال میں بحر تبسم کی تصویر نے اس غریب کو تباہ کیا ہے۔ ہم نے کہا" ٹھیک کہتے ہو۔ یقیناً بحر تبسم کی تصویر کا اثر ہے" اور ہم نے فوراً ہی بحر تبسم والی تصویر پر تحقیقی نظریں ڈالیں یہ تصویر آج سے پہلے ہم کو اسقدر دلکش کبھی نظر نہ آئی تھی لیکن اب جو ہم نے اسکو دیکھا تو واقعی ایک قیامت تھی منجھلی بیگم تو خیر پھر بھی ایک عورت ہے اور اسکے پاس ایک کمزور دل ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ تصویر خود ہماری نہ ہوتی تو آج ہم اسیر عاشق ہو گئے ہوتے۔ بہرحال اب یہ معاملہ گویا بالکل طے ہو گیا کہ اسی تصویر کو منجھلی بیگم نے دیکھا ہے اور اسی تصویر نے اُس غریب کا دل چھینا ہے۔

اب ہم سمجھے اور منجھلی بیگم کے مفصل نامۂ شوق کا انتظار

دنوں سے ہفتے ہوگئے مگر منجھلی بیگم کا کوئی خط نہ آیا۔ روزانہ دن میں دو چار مرتبہ نسیم سے منجھلی بیگم کا تذکرہ ہو جاتا تھا۔ اور ہر مایوسی کے بعد ایک اُمید پیدا ہو جاتی تھی۔ کبھی تو خیال پیدا ہوتا تھا کہ کہیں جواب کے الفاظ سے منجھلی بیگم کے نازک دل کو ٹھیس تو نہیں لگ گئی لیکن پھر ہم کہتے تھے کہ ہمارا جواب تو ایسا نہیں تھا اور واقعی ہم سوائے اسکے اور کیا جواب دیتے لیکن یہ جملہ ایک ٹکڑی پر پہونچا دیتا تھا جہاں سے یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ مگر جب اسی ادھیڑ بن میں دن گذرنے لگے تو رفتہ رفتہ یہ خیال بھی مٹنے لگا۔ اور تھوڑے سے ہی دنوں میں منجھلی بیگم کی طرف سے لاپروائی سی پیدا ہوگئی بلکہ ایک حد تک ہم نے منجھلی بیگم کو بھلا بھی دیا۔

ہماری اہل خانہ کی رائے ہمارے متعلق یہ ہے کہ ہم نہایت نیک چلن واقع ہوئے ہیں۔ اس رائے کے دو پہلو ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ ہم میں بدچلنی کرنیکی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم میں صلاحیت تو ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ شدت سے پاکدامن اور باعصمت واقع ہوئے ہیں۔ بہرحال ان دونوں پہلوؤں میں سے جو پہلو بھی ان کے پیش نظر ہو لیکن یہ واقعہ تھا کہ اگر کوئی ان کے سامنے ہمارے چال چلن کے متعلق ذرا بھی کچھ کہتا تو وہ اس کا منہ نوچ لیتیں

اور ہماری شکایت کرنیوالے کی خود ہی شامت آجاتی، لیکن اسکا کیا
علاج کہ اُن کو دستاویزی ثبوت مل چکا تھا۔ اور دھوبی کو کپڑے
دیتے وقت جب ہماری قمیص کی جیب سے منجھلی بیگم کا نامۂ شوق ملا
تو انکے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہماری تمام عصمت مآبی
ایک سراب ثابت ہوئی، اور ہم اُن کی نظروں میں سوائے
ایک دغاباز، بدچلن، آوارہ اور بدمعاش شوہر کے کچھ نہ رہ گئے
ہمارے فرشتوں کو بھی اسکی خبر نہ تھی کہ ہم بیگم کی نظروں میں
نہ صرف مجرم بن چکے ہیں بلکہ بغیر ہمارے بیان کے ہمیں جرم بھی ثابت
ہو گیا ہے لیکن ہم جو گھر میں پہونچے تو نہ بیگم مسکراتی ہوئی دوڑیں
اور نہ اُن کی شیریں "خوش آمدید" نے ہم کو شوہرانہ فخر کا موقع دیا
بلکہ ہم نے یہ دیکھا کہ ملازمہ تک ہم کو حقارت کی نظروں سے دیکھ رہی ہے
اور بیگم کا کہیں پتہ نہیں۔ ہم نے دلمیں کہا "یا الٰہی خیر" اور ملازمہ سے
پوچھا "بیگم کہاں ہیں؟" اُس نے لاپرواہی سے کمرہ کی طرف
اشارہ کر دیا۔ اور ہم سہمتے ہوئے کمرے میں پہونچ گئے دیکھتے
کیا ہیں کہ بیگم مسہری پر لحاف میں چھپی ہوئی دراز ہیں اور کمرے میں
ایک سکوت کا عالم ہے۔ ہم نے اپنے دلمیں فیصلہ کر لیا کہ یہ فلٹ
نہ لانے کا نتیجہ ہے کہ مچھروں کی کثرت نے بیچاری کو ملیریا میں

مبتلا کر دیا۔ لحاف کا کونا اُٹھا کر دیکھا تو بیگم کا چہرہ مُرخ انگارہ ہو رہا تھا اور بخار کی شدت سے رخساروں پر آنسو بھی تھے۔ ہم نے ماتھے پر ہاتھ رکھکر کہا۔ "کیسی ہو بیگم؟" مگر جواب ندارد۔ اب ہم نے ماتھے کو گرم نہ پا کر رخساروں پر ہاتھ رکھدیا اور پھر پوچھا "کیسی ہو بیگم؟" پھر جواب ندارد۔ اور رخساروں پر بھی بخار کی کوئی علامت نہیں ہم نے ہاتھ پکڑ کر نبض ٹٹولی اور کہا "کیا حال ہے آخر کچھ کہو تو سہی" نبض ماشاء اللہ بالکل تندرستی والی چل رہی تھی مگر بیگم نے کچھ اس طرح بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔ "اچھی ہوں کہ ہم اور پریشان ہو گئے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُن کا ہاتھ دبا کر کہا۔ اچھی تو ہو۔ مگر بتاؤ تو کہ طبیعت کیا ناساز ہے؟ انھوں نے بجائے کوئی جواب دینے کے ہمارے زانو پر سر رکھدیا اور سسک سسک کر رونا شروع کردیا۔ اب ہم نے اپنے خاندان بھر کے تمام بیماروں کے نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ وہ تو اچھے ہیں، وہ تو خیریت سے ہیں،" لیکن بیگم کی سسکیاں مع گرم آنسوؤں کے بڑھتی ہی جاتی تھیں اور [illegible] کہ وجہ نامعلوم اور تفصیلات کا انتظار۔ بیگم سے [illegible] کیا جاتا تھا۔ اور اس رونے سے خدا جانے کیا کیا وہم دل میں سما کر جان

لئے لیتے تھے۔

جب ہم نے زیادہ پوچھا تو بیگم نے ہمارا ہاتھ زور سے اپنے ہاتھوں دبایا اور اس طرح آواز کے ساتھ رونا شروع کیا کہ ہم بوکھلا کر معہ جوتوں کے مسہری پر بیٹھ گئے اور جاڑے کے موسم میں لگے بیگم کو دامن کی ہوا دینے۔ اب خود ہماری حالت بھی ناگفتہ بہ تھی بلکہ شاید ہم نے بھی بیگم کے ساتھ رونا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال اتنا تو ہمکو یاد ہے کہ جب بیگم کی سسکیاں ذرا دھیمی ہوئیں تو ہمنے اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں کو بالکل برف کی طرح ٹھنڈا پایا۔ اور جب بیگم نے اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھے تو ہم کو بھی اپنے آنسوؤں کا خیال آیا۔ جو خدا جانے کب سے جاری تھے۔ ہم نے موقع غنیمت سمجھکر کہا۔ بیگم اپنے دلکو سنبھالو جو کچھ ہونا تھا وہ تو خیر ہو ہی گیا مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا بیگم نے یہ سنتے ہی پھر سسکیاں بھرنا شروع کر دیں۔ اور وہی حالت ہو گئی جس نے ذرا سکون ہوا تھا۔ اب ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ وجہ تو خیر بعد میں معلو. . . 1. ئے گی۔ اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو سن ہم نے فوراً سرد پانی سے اُن کا منہ دُھلایا۔ تھوڑا . . . ۔ اور اُن کو خاموش کر کے

خود بھی اُن کے سامنے اسلئے خاموش بیٹھ گئے کہ اگر ہم کچھ بولے
تو اُن کا غم پھر تازہ ہو جائے گا۔ لیکن اس کیفیت میں بہ مشکل
چند منٹ گذرے ہوں گے کہ خود بیگم نے سسکیاں بھرتے ہوئے
کہا۔ واہ ری قسمت ہم جسکو اپنا سمجھتے تھے وہ بھی اپنا نہیں ہے۔
ہمنے تشفی آمیز لہجہ میں کہا۔" خدا کو یاد کرو اس دنیا میں کوئی کسی کا
نہیں ہے بس سب خدا کے ہیں۔"

بیگم نے چیخ مار کر روتے ہوئے کہا۔ "جب آپ ہی میرے
نہ رہے تو میں زندہ رہکر کیا کروں گی۔ ہم نے جلد ہی سے
گھبرا کر کہا۔" نہیں نہیں میں تو تمھارا ہوں یہ تم کیا کہہ رہی ہو
بیگم میں تمھارا ــــــ"

بیگم نے روتے ہوئے کچھ غضبناک ہو کر کہا۔" بس اب
اس منہ سے یہ الفاظ نہ کہنا مرد کی ذات میں وفا کا نام نہیں ہوتا۔"

ابتو ہم بہت سٹپٹائے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے اور ہم نے کہا
"ارے بیگم آخر یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

اسی طرح روتے ہوئے کہا" بس بس [illegible] اب اس طرح سے مجھے
دھوکا نہ دو جو تمھاری بیگم ہیں [illegible] سے بیگم کہو"
ہم نے حیران ہو کر کہا "ار[illegible] یعنی میری بیگم؟"

وہ زور سے بولیں " ہاں ہاں تمھاری بیگم۔ ایسے بھولے پن سے پوچھ رہے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔"

ہم نے اپنے دل میں کہا "یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے" اور بیگم سے کہا " خدا گواہ ہے بیگم میں کچھ نہیں سمجھا " کہنے لگیں " یہ جھوٹی خدا کی گواہیاں کسی اور کو دو مجھکو تمھارے سب گن معلوم ہو گئے۔ تم جھوٹے تمھاری محبت جھوٹی اور جو تمپر اعتبار کرے اُسے کیا کہوں"

ہم۔ " یعنی خواہ مخواہ !"

کہنے لگیں۔ کیسے بیچارے معصوم بن رہے ہیں اور جب اپنی چہیتی کے پاس جاتے ہیں جب اس چڑیل سے نامہ و پیام ہوتا ہے جب اس ڈائن سے محبت جتائی جاتی ہے اسوقت یہ بھولا پن کہاں جاتا ہے" ہمکو ہنسی آگئی اور ہم نے کہا " تم کچھ گھاس کھا گئی ہو کیا ؟" کہنے لگیں " اچھا یہ تو بتاؤ وہ موا ہادی حسین کون ہے"

ہم نے کہا " ہادی حسین ؟"

ہم کو واقعی نہ [illegible] کہ ہادی حسین کون ہیں۔ ہم نے کچھ غور کرکے کہا [illegible] کون ہادی حسین ؟" کہنے لگیں۔ " اللہ رے [illegible] رہے ہو اتنک بیوقوف بنا رہے

ہم۔ " آخر یہ تم کو ہو اکیا ہے"؟

بیگم نے " یہ دیکھو " کہکر ہمارے سامنے وہی خط ڈالدیا جو اب ہمارے ذہن میں بھی نہ تھا یعنی وہی منجھلی بیگم والا خط ہم نے اُسکو پڑھا

" تسلیم۔ یہ ہادی حسین آتے ہیں ان کو کاغذ میں سب حال تحریر کر کے دیدیجئے اُن کو کچھ معلوم نہیں ہے نہ کچھ کہہ سکیئے گا۔ فقط"

یہ خط وہ تھا جس نے خود ہم کو اپنے متعلق بدگمان کر دیا تھا۔ اب ہم بیگم کی بدگمانی کس طرح رفع کرتے اور اپنے کو اس تحریری ثبوت کے بعد کس طرح بے گناہ ثابت کرتے بس خط ہمارے ہاتھ میں سے چھوٹ کر گر گیا اور ع

"کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"

لیکن ہم نے اپنی صفائی پیش کر دی " یہ خط تو یہ خط ہے یعنی اس خط کے متعلق ہم کو اللہ قسم کچھ نہیں معلوم کہ یہ کس کا ہے"

بیگم نے سر ہلا کر کہا " بجا ارشاد"

ہم نے پھر کہا " اللہ جانتا ہے کہ اس خط کی لکھنے والی کو ہم نہیں جانتے "

بیگم۔ " ہاں مگر اتنا جانتے ہ[illegible] والی ہے

لکھنے والا نہیں ہے۔"

ہم۔ یہ تو ہمنے اس خط لانیوالے ہا دی حسین سے پوچھ لیا تھا اور اُسنے کہا تھا کہ منجھلی بیگم نے بھیجا ہے۔

بیگم۔ جی اور کیا وہ منجھلی بیگم جو ہیں اُنھوں نے یونہی ان بیچاری کو خط لکھدیا ہے اور یہ بھی لکھدیا ہو کہ سب حال تحریر کردو اور خط لانیوالیکو کچھ معلوم بھی نہیں ہو۔ اُرے میں کہتی ہوں اتنا جھوٹ نہ بولو آخر اس سفید جھوٹ سے کیا فائدہ؟

ہم۔ بیگم تم کچھ بھی کہو مگر ہم ہیں بے قصور ویسے تو تمھارے شوہر ہیں جو چاہے کہو۔

بیگم۔ بیشک بیشک آپکے بے قصور ہونے میں کسکو شبہ ہوسکتا ہو خاصکر ایسی صورت میں جبکہ خط تک پکڑ لیا گیا ہو۔

ہم۔ بیگم تمھاری جان کی قسم کہ اس خط کے متعلق مجھکو خود کچھ نہیں معلوم ہے بلکہ میں نے خود اس کا جواب یہی دیا ہے کہ میں اس خط کو کچھ نہیں سمجھا۔ آپ سمجھائیے تو سمجھوں کہ یہ معمہ کیا ہو؟

بیگم۔ اچھا میں رہنے دو بتانے کو آپ تو چوری اُسپر سینہ زوری

مگر ہمنے تھا آپ ہی قدر آپ تو بڑے رنگیلے ہو۔

کس طرح بیگم کو یقین دلائیں۔

بات بجائے بننے کے بگڑتی جاتی تھی اور بیگم کو کسی طرح اطمینان ہی نہ ہوتا تھا۔ ہم نے لاکھ لاکھ قسمیں کھائیں لاکھ لاکھ ان کو یقین دلایا لیکن وہ تھیں کہ ہماری ہر قسم کو جھوٹ ہمارے ہر لفظ کو فریب ہماری ہر صفائی کو دغابازی اور ہمارے ہر بیان کو چالاکی ہی سمجھ رہی تھیں۔ اب اُن سے زیادہ ہماری حالت قابل رحم تھی۔

خیر وہ تو منہ پھیلائے لیے ہوئے گویا اپنی تمام توقعات کا رونا رو رہی تھیں۔ لیکن یہ تو ہم کہہ رہے تھے کہ کر توڑ نہیں تو خدا کے غضب ڈر۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو بیکار بیٹھے بٹھائے شامت آگئی۔ اس منجھلی بیگم نے ہم کو کہیں کا بھی نہ رکھا۔ خیر وہ خود نہ ملتی لیکن اُسنے تو بیٹھے بٹھائے ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی کاش یہ صورت اُسوقت پیدا ہوتی جب اس واقعہ کی اصلیت بھی ہوتی۔ لیکن یہاں تو گناہ بے لذت والا معاملہ تھا۔ خدا جانے آج کس کا منہ دیکھکر اُٹھے تھے کہ گھر آکر نہ کھانا نصیب ہوا نہ پانی بلکہ خون پانی ایک ہو کر رہ گیا۔ بیگم تھیں کہ مقاطعہ جو ئی بھی کیے ہوئے تھیں اور ستیہ گرہ بھی۔ لیکن ہم تو گویا مجسم [illegible] ہم ہوتا تھا کہ

بعبور دریائے شور کی سزا بھگت
گلے میں پھانسی کا پھندا پڑا

تمام رات اسی کشمکش میں گذاری۔ بیگم کی خوشامد کی بیگم کو سمجھایا۔
بیگم سے محبت جتائی بیگم کو بہلانے کی کوشش کی لیکن بیگم کیا کہتیں
گویا ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اور ہم تھے کہ گویا ع

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"

اسی طرح منہ لٹکائے ہوئے دفتر میں آ کر بیٹھ گئے اور اپنی کہانی
شامتِ اعمال پر غور کرنے لگے۔ نسیم آئے تو اُن سے افسانۂ غم کہا۔
اُنھوں نے سنتے ہی کہا "ارے یار اس کا خط تو کل پھر
آیا ہے" ہم نے کہا "جہنم میں ڈالو اس کو ایک خط نے تو یہ آفت
برپا کی اب دوسرا تو گھر ہی سے نکلوا دے گا" کہنے لگے نہیں تو
وہ تمھاری بیگناہی کا ثبوت ہے" ہم اُچھل پڑے اور جھپٹ کر
خط نسیم کے ہاتھ سے لے لیا اُس میں لکھا تھا:-

"تسلیم۔ آپ کچھ نہیں سمجھے تو میں سمجھاتی ہوں کہ آپکے
اخبار میں [illegible] صاحب کی شادی کا اشتہار نکلا ہے ان کا پورا
اسکو کسی سے بتانا نہیں چاہتی
[illegible] کو دیجیے [illegible]

ہم نے خط پڑھتے ہی کہا" لاحول ولا قوۃ"
نسیم نے کہا۔" آہاہاہا یہ اچھی دلّگی رہی۔"

اور ہم چھلانگیں مارتے ہوئے گھر میں جا کر بیگم کے اوپر معہ خط کے گر پڑے۔ ور کہا لو یہ دیکھو اب تو یقین آئے گا۔ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر لاپرواہی سے خط لیلیا اور پڑھنے لگیں لیکن ہمنے دیکھا کہ ان کے چہرہ کا ورم گھٹنے لگا۔ اور خط پڑھنے کے بعد انھوں نے پوچھا۔ کیا کوئی شادی کا اشتہار چھپا تھا
ہم نے کہا اور کیا یونہی یہ خط آیا تھا۔ یہ دیکھو اشتہار ہے۔
بیگم نے اشتہار دیکھکر کہا" توبہ اللہ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بات ہے"
ہمنے ایک ادائے دلبری سے کہا:۔" جی نہیں ہم تو بدچلن ہیں بدمعاش ہیں۔ شہدے ہیں۔"
بیگم نے بُرا مان کر کہا:۔" خدا نہ کرے"

جیسے ہمارے دن پھرے خدا سب کے پھیرے

فقط

لغت اور ادبیات اردو کا نایاب ذخیرہ

تاریخ و سوانح عمریان		لغات و ادب		فنون و اخلاق	
نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
اخبار اندلس ۳ جلد	عـہ۵	بازاری زبان	۸/	معارف النغمات حصہ اول	للعہ/
تاریخ مغرب	عـ/	لغات سعیدی	للعہ/	معارف النغمات حصہ دوم	صہ/
خلافت موحدین	للعہ	لغات کشوری	سے/	نمکدان ظرافت	۶/
خلافت مولدین	عیـ/	گنجینۂ تحقیق مجلد	للعہ	عصمتی کرشمہ	عیـ/
مختصر تاریخ اسلامی حصہ اول	۸/	مفیص اردو	۵/	خواتین کی دستکاریان	۸/
مختصر تاریخ اسلامی حصہ دوم	۹	تصریح الاغلاط	۴/	بچون کی تربیت	۱۰/
مختصر تاریخ اسلامی حصہ سوم	۱۰/	منیر اللغات فارسی	عا/	روداد قفس	۶/
مختصر تاریخ اسلامی حصہ چہارم	عـہ/	منیر اللغات اردو	عیـ/	تحریر النساء	۱۲/
عبادت اور اسکی غایت	۸/	محاورات نسوان	۸/	لڑکیون کی انشاء	۱۲
الصالحات	عیـ/	جوہر اللغات	۱۲/	عصمتی کشیدہ	عـہ/
امامت کی مائین	عـہ/	گوہر اللغات	۱۲/	ریاض الاخلاق	عـہ/
الزہرا	۱۲/	چراغ سخن	عـہ/	خزینۂ اخلاق	۶/
اسوۂ حسنہ	۸/	مثنوی ناسخ	۱۲/	حدائق الاخلاق	عـہ/
ہند و شعرا	سہ/	دکھنی لغت	۸/	بہشتی جھومر	۱۰/
شیو نہار فلسفی	عیـ/	جواہرات کلیات نظیر	عیـ/	مختصر دنیا	۵/
سوانح اکبر الہ آبادی	عـہ/	عزیز اللغات	عـ/	ہندوستان کی بہادر عورتین	۸/
سفرنامہ عراق	عـہ/	تذکرہ ریختی	عـہ/	معدن الموسیقی	سیـ
تاریخ افغانستان	عیـ/	تاریخ اردوئے قدیم	عیـ/	مبادی فلسفہ	عـہ/
اسلام اور غیر مسلم	۸/	دکن میں اردو	عـ/	خون کے آنسو	۴/
اسلامی مساوات	۸/	منتخب کلام ہند		اسلامی پردہ	
اسلامی کارنامے	عـہ/	اردو کے اسالیب			
تاریخ مغربی یورپ	عـ/	رباعیات			
سیر المصنفین حصہ اول	۸/				
سیر المصنفین حصہ دوم					

تاریخ اور اسلامیات		سیاسیات		ادبیات	
نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
قومی اور اسلامی تعلیم	۴/	جذبات جوہر	۲/	لالہ رخ	عہ
مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ	۸/	زندان حماقت	۸/	مقدمہ شعر و شاعری	عہ
ہمارے نبیؐ	۳/	جذبات حریت	۸/	نالۂ مشیر	عہ
سیرۃ الرسل	۱۲/	عرض جوہر	۸/	کلام مشیر	عہ
ٹالسٹائی	۳/	کلام جوہر	۸/	نامۂ مشیر	۸/
جمال الدین افغانی	۳/۸	تقاریر محمد علی	۸/	طرز زندگی حصہ ۱	عہ
تاریخ خلافت کامل	للعہ	نہرو رپورٹ کامل	۶/	طرز زندگی حصہ ۲	عہ
تاریخ الامت حصہ ۱	عہ	لمعات صداقت	۳/	سالومی	۱۲/
تاریخ الامت حصہ ۲	۶/	دعوت حق	۸/	ریاض گل	۸/
تاریخ الامت حصہ ۳	عہ	زوال خلافت	۸/	تذکرہ خندہ گل	۶/
تاریخ الامت حصہ ۴	۶/	ترکان احرار	عہ	سوانح مولانا آزاد	۱۲/
تاریخ الامت حصہ ۵	۶/	گورنمنٹ ہند	عہ	نیستان	عہ
تاریخ الامت حصہ ۶	۶/	مرقع ہند	۶/	جذبات اوج	۸/
تاریخ الامت حصہ ۷	عہ	شیر میسور	۱۲/	حضرت رشید	عہ
اسلامی تہذیب	۳/	غریب ہندوستان	۱۲/	جذبات بھاشا	۱۲/
تاریخ فلسفہ اسلام	۶/	خوشحال ہندوستان	۱۲/	ایشیائی شاعری	عہ
عربوں کا تمدن	۶/	قومی مثنوی	عہ	انسانی قربانیاں	۸/
نجد و حجاز	عہ	معالم السیاست	۶/	شیرین سخن	۸/
سلاطین فاطمیہ	۱۲/	مظالم پنجاب	۶/	مثنوی گنجینہ	عہ
جدید دنیائے اسلام	۶/	سوراج		عروس ہندی	عہ
یادرفتگان	۳/	تقاریر گوکھلے	۱۲/	حزن اختر	۸/
[illegible]ت العلما		سفر گورنمنٹ		دیوان جگر بسوانی	عہ
[illegible] اریخ				حیات انیس	۶/
				مکاتیب امیر	۶/
				سیرۃ عمر بن عبد العزیز	۸/

سفرنامے

نام کتاب	قیمت
سفرنامہ اندلس	ہے/
سفرنامہ ابن بطوطہ حصہ اول	للعہ/
سفرنامہ ابن بطوطہ حصہ دوم	سے/
سفرنامہ مصر	سے/
سفرنامہ حسن نظامی	ع/۸
سفرنامہ غلام الثقلین	سے/
سفرنامہ برنیر کابل	للعہ/
سیر یورپ	سے/
سفرنامہ شبلی	عہ/۸
سیر دہلی	۱۲/
سیاحت زمین	عہ/
طواف زمین	عہ/
سفرنامہ حجاز	عہ/۴
سفرنامہ یمن	عہ/۸

کھانا پکانے کی کتابیں

نام کتاب	قیمت
ذائقہ	۸/
مطبخ کنگ جارج	عہ/۱۲
بڑا باورچی خانہ	۴/
مذاقیہ کھانے	۶/
ہنڈکلیا	۸/
نعمت خانہ	عہ/۱۲
خوان یغما	۸/
بھوجن پرکاش	۸/
الوان نعمت حصہ اول	عہ/
الوان نعمت حصہ دوم سوم	عہ/
ہدایت نامہ باورچیان	عہ/۱۲
خوان دعوت	عہ/
خوان نعمت کلاں	۳/
نیا باورچی خانہ	۶/
اچار چٹنی	۲/
خوان نعمت مطبوعہ نامی	۸/
خوان نعمت مطبوعہ مجتبائی	۸/
خوان نعمت مطبوعہ کانپور	۸/
ناشتہ	۱۰/
بچوں کے کھانے	۸/
بیماروں کے کھانے	
الوان نعمت ضمیمہ	
عصمتی دسترخوان	

سیاسیات

نام کتاب	قیمت
ایک سلطنت کا پیغام	۱/
خیالات مقبول	۸/
جذبات قومی	۱/
نوآبادیوں کا غلام	۱/
اسکیم اصلاحات	۱/
اصلاحات بعد از جنگ	۱/
خواتین قوم	۱/
طلبا اور پالیٹکس	۱/
صدارتی ایڈریس مونٹیگو دار	۵/
مراسلات قبل از جنگ	۶/
ہوم رول	۵/
جرمنی اور موجودہ جنگ	عہ/۴
دعوت عمل	۸/
سمرنا کی داستان	۳/
وداع اسلام	۲/
روایات اسلام	۳/
تذکرہ احرار اسلام	۱۲/
جذبات احرار	۴/
انقلاب فرانس	عہ/۴
انقلاب ترکی	ع

تصانیف ڈاکٹر اقبال

نام کتاب	قیمت
شکوہ	۲/
جواب شکوہ	۳/
شمع و شاعر	۳/
تصویر درد	۴/
اکبری اقبال	۳/
مکمل ترانہ	۲/
فریاد امت	۳/
خضر راہ	۴/
بلال ۲/ نالہ یتیم	۳
خلافت اسلامیہ	۳

دنیائے اسلام میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کرنے والی تاریخ

یعنے

تاریخ اسلام

یہ قابل دید تاریخ صدیقی بکڈپو آگرہ سے شائع ہوئی ہے جس کو زمانہ حال کے مصری ادیب اور مورخ علامہ محی الدین نے صدہا معتبر تواریخ کا عطر نکال کر تالیف کیا اور ہندوستان کے ایک ماہر فن نے اردو زبان کا لباس پہنایا اس کے معتبر مستند اور جامع ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک کے مدارس میں یہ تاریخ ہے انتخابات میں وہ روایات شامل کی گئی ہیں کہ جنھوں نے یورپ میں اشاعت مذہب کا کام انجام دیا عربی جرمنی فرانسیسی اخبارات نے اس پر زبردست ریویو کئے مصر کے مسلمانوں میں جو بیداری پھیلی ہوئی ہے اور جوانوں کے ساتھ بچوں اور عورتوں میں قومیت کا احساس پایا جاتا ہے وہ بہت کچھ اسی قسم کے لٹریچر کا ممنون احسان ہے اختصار روایات اور سادگی بیان کے لحاظ سے یہ تاریخ عام طور پر بچوں جوانوں اور بوڑھوں میں مقبول ہے اس تاریخ کے ۵ حصے ہیں تاریخ کی ماہیت بیان کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے حالات قلم بند کئے ہیں۔ کہ دوسری سیرتیں پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوسرے حصہ میں خلفائے راشدین کا حال ان کا تقدس غیر قوموں سے رواداری نظام جمہوریت سخاوت اور شجاعت وغیرہ کا حال درج ہے تیسرے حصہ میں خلافت بنی امیہ کے ایسے کارنامے تحریر ہیں جو متعدد تواریخ میں نہیں مل سکتے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا مختصر حال۔ چوتھے حصہ میں خلافت عباسیہ کے واقعات امویہ و عباسیہ کے سنین کی جدول جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں واقعہ فلاں سنہ میں ہوا۔ پانچویں حصہ میں خوبصورت شہر اندلس کے روح افزا مناظر قرطبہ کی صناعیاں دیگر اسلامی حکومتوں کے حالات آخر میں امتحانی سوالات اور جوابات جس سے طلبا کو مضامین کا خلاصہ کرنا آتا ہے۔ اگر آپ فلسفہ تاریخ کے جدید اصول سے واقف ہونا چاہتے ہیں اور خواہش ہے کہ آئندہ نسلیں اسلاف کی خوبیاں حاصل کر[illegible] [illegible] س تاریخ کا [illegible] پیدا ہو تو اس کتاب کو ضرور خرید لیجیے (حصہ اول [illegible]

منیجر

قابل دید ناول ڈرامے اور نایاب افسانے

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
قطرات اشک	عہ/	بکھری پتی	۶/	ناول نمبر ۱۱۳	سے۴/
جلندر ناتھ	عہ/	ستونتی	۸/	شب زندگی کامل	۶ع/
مناظر طرابلس	۵/	سیاحت روس کے اعلانات	۶/	بیوہ دنیا انسان	۵/
اپنی کا دکھ	عہ/	تیغ کمال	عہ/	نقاب اٹھنے کے بعد	۵/
فسانہ سعید	۸/	تمغہ شیطانی	۱۲/	گوہر مقصود	۶/
اینن کا دم واپسین	۶/	سراب مغرب	۸/	موودہ	۸/
بہرام کی آزادی	۱۲/	منازل السائرہ کامل	۶ع/	شہنشاہ کا فیصلہ	۱۴/
سیلاب اشک باتصویر	عہ۴/	موہنی	۱۲/	چندر کلا	۸/
بے زبان دوست	عہ/	وداع ظفر	عہ/	گلستاں خاتون	عہ۴/
انگوٹھی کا راز	۶/	یاسمین شام	عہ/	صبح زندگی	عہ۴/
بنت الوقت	۸/	وداع خاتون	۶/	شام زندگی	عہ/
جوہر عصمت	۶/	طوفان اشک	عہ/	دوشیزہ وحشتم اعلیٰ	عہ/
جمال ہمنشین	عہ/	ثانی عشو	۱۰/	دوشیزہ عالم	سے۴/
پیکر وفا	۸/	منازل ترقی	۴/	بہار عروس	عہ۴/
تنویر عصمت	۶/	شاہین دراج	۸/	دلہن کانفرنس	عہ۴/
جوہر قدامت	عہ۴/	درس عشق	عہ۸/	تصویر عروس	عہ/
تائید غیبی	۸/	زر پرست	۷/	بزم عروس	عہ/
پراسرار قتل	۶ع/	تین بندوق باز	عہ۸/	مژدہ وصال	عہ/
اعلان آزادی	۵/	کرشمہ رقابت	۸/	عہد شباب	عہ/
سرگزشت ہاجرہ	۱۰/	انقلاب قسطنطنیہ	۸/	قانون مواصلت	عہ۴/
بچہ کا کرتہ	۴/	کنجی کا راز	۶/	میاں بیوی	عہ/
زندگی	۱۲/	وانڈا کی سرگزشت	۴/	لذت النسا	عہ/
شر			۴/	زن و شوہر	ممہ/
ع			۸/	عروس نوشاہ	عہ۴/
			۶/	کوک شاستر	عہ/
				محبت	۴/